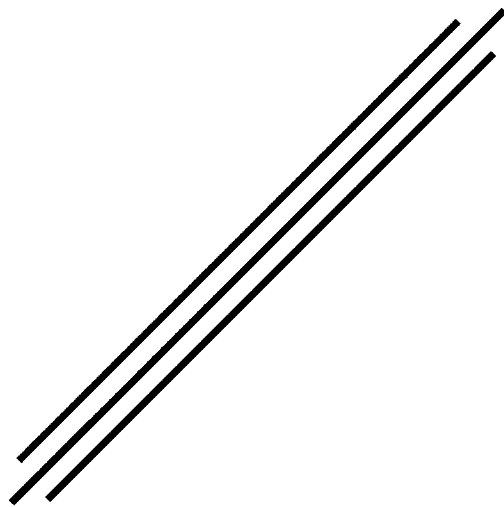
سلسلہ تالیفات وافاداتِ حکیم الاسلامؒ

جماعتِ اسلامی کی تحریری تلبیس کا ایک افسوسناک نمونہ



دارالعلوم دیوبند کا ایک فتویٰ

اور اس کی حقیقت

• •

جماعتِ اسلامی کی تحریری تلبیس کا ایک افسوسناک نمونہ

پچھلے دنوں جماعتِ اسلامی کے ایک ہندوستانی آرگن نے غلام نبی صاحب (۱) جالندھری، فورٹ عباس (بھاول پور) کا ایک مضمون شائع کیا تھا جس میں مضمون نگار نے خودکو دیوبند کا شاگرد اور دیوبند کا خیر خواہ ظاہر کرتے ہوئے دارالعلوم دیوبند کے دارالافتاء کا ایک فتویٰ نقل کیا تھا، جس میں حضرت مولانا نانوتوی قدس سرہ' کی کتاب ''تصفیۃ العقائد'' کی ایک عبارت کو سامنے رکھ کر ان پر کفر کا حکم لگایا گیا تھا، اس مضمون کی اشاعت نے ملک و بیرونِ ملک میں ایک عجیب صورتِ حال پیدا کردی ، اور احباب و متعلقین نے استفسارات کیئے کہ اس فتویٰ کی حقیقت کیا ہے؟ دارالافتاء سے تحقیق کی گئی اور جس عبارت پر یہ فتویٰ دیا گیا تھا، اُسے اصل کتاب میں دیکھا گیا تو معلوم ہوا کہ مستفتی نے کمالِ شوخ چشمی اور تیرہ باطنی کے ساتھ حضرت نانوتویؒ کی چند عبارتوں کو توڑ مروڑ کر کوئی جملہ کہیں سے اور کوئی جملہ کہیں سے لیکر، ایک مسلسل عبارت خود بنائی اور اسے مصنف کے نام اور کتاب کے حوالے کے بغیر دارالافتاء کے سامنے رکھا گیا۔

جیسا کہ حضرت مہتمم صاحب مدظلہ' نے اپنے اس مضمون میں تحریر فرمایا ہے، حضرت نانوتویؒ کی زیر بحث کتاب ''تصفیۃ العقائد'' خود دینی عقائد میں جدت و بدعت کرنے والے اہل ہواؤ ہوس کی تردید میں لکھی گئی ہے، اس میں اس اس کا کیا موقع تھا کہ اپنے موقف ومنصب کے خلاف کسی عقیدہ کی تبلیغ کی جاتی۔ اور پھر انبیاء علیہم السلام کے متعلق ایسے غلط عقیدہ کا ظہور اور وہ بھی حضرت نانوتویؒ کے قلم سے؟ اگر سورج مشرق کی بجائے مغرب سے نکل سکتا ہے، اگر کفر وضلالت سے نورِ باطن اور نجاتِ آخرت ممکن ہے، اور دنیا کی وہ ساری چیزیں جن کی ماہیت وخاصیت نہ بدلتی ہے نہ بدل سکتی ہے، اپنی خصوصیات سے دست بردار ہوسکتی ہیں تو شاید یہ بھی ممکن ہو سکے کہ حضرت نانوتویؒ کے قلم سے ایسے عقیدہ کا اظہار ہو۔

جن حضرات نے اس صورتِ حال پر تشویش ظاہر کی تھی ان کی تشویش بجا تھی اور امید ہے کہ حضرت مہتمم صاحب مدظلہ' کے اس مضمون سے ان کی تشویش اطمینانِ خاطر میں بدل جائے گی۔ اس انکشاف سے ہمیں حد درجہ افسوس ہوا کہ جماعتِ اسلامی نے اختلافِ عقیدہ وفکر کو اب ایسی گھناؤنی اور مکروہ شکل دیدی ہے اور اپنے تحفظ کی خاطر انہوں نے یہ غلط راستے اختیار کیئے ہیں۔ ادارہ (۲)

---

(۱) ذاتی طور پر تحقیق سے معلوم ہوا کہ ان صاحب کا جماعتِ دیوبند سے کوئی تعلق نہیں، یہ اپنے علاقہ کی جماعتِ اسلامی کے ذمّہ دار عہدہ دار بھی ہیں۔

(۲) یہ کتاب مکتبہ دارالعلوم دیوبند سے شائع ہوئی تھی اسلیئے ادارہ سے مراد اسی مکتبہ کے ذمہ دار حضرات ہیں۔ محمد عمران قاسمی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ایک مقالہ نگار نے اخبار ’’دعوت‘‘ مورخہ ۱۷؍جنوری ۱۹۵۶ء میں بعنوان ’’علمائے دیوبند کی خدمت میں‘‘ اساتذۂ دارالعلوم کو مخاطب کرتے ہوئے ایک شکایتی مضمون شائع کرایا ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ آپ حضرات کے سامنے جب آپ کے سلف کی کوئی مبہم یا موہم عبارت آتی ہے جس سے مخالفین نے کسی برے محمل پر اتار لیا ہو تو آپ اس کی توجیہ وتاویل کر کے اسے بہرحال محملِ حسن پر اتارنے کی کوشش کرتے ہیں اور کبھی اس معنی پر نہیں رہنے دیتے جو مخالفین اس عبارت سے لے کر ان کے خلاف حجت پکڑتے ہیں۔ لیکن مودودی صاحب کی اس قسم کی عبارتیں سامنے آنے پر یہ صورت اختیار نہیں کی جاتی، یہ نہیں ہوتا کہ توجیہِ حسن کر کے انکی عبارت کو بھی کسی اچھے محمل پر محمول کر لیا جائے۔

موصوف نے اس سلسلہ میں حضرت حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی قدس سرہٗ کی چند عبارتیں بھی پیش کی ہیں جن کا مطلب مخالفین نے غلط لیا ہے، لیکن علماءِ دیوبند نے انکی عبارتوں کی وضاحت کرتے ہوئے انکا صحیح محمل ظاہر کر دیا ہے۔

محترم مقالہ نگار کی نظر اگر اُس اصول پر ہوتی جس کی روشنی میں عبارات واقوال کی تاویل وعدمِ تاویل کا فیصلہ کیا جاتا ہے تو انہیں اتنا طویل مقالہ سپردِ قلم کرنے کی زحمت گوارہ نہ کرنی پڑتی، شکایت اور ہمدردی کا تو شکریہ کہ اس سے یگانگت وہمدردی کا مظاہرہ کیا گیا، لیکن خلافِ اصول اور بے محل شکوہ پر شکوہ کے اصول اور واقعات سے اغماض کیوں برتا گیا؟

ہر شخص کے قول کا مطلب اس کی مجموعی زندگی کو سامنے رکھ کر لیا جائے گا

اصول یہ ہے کہ ہر شخص کے قول کا مطلب اس کی مجموعی زندگی کو سامنے رکھ کر لیا جاتا ہے، اگر عقیدہ وعمل اور خلق وحال کی زندگی درست ہے تو اس کے موہم کلام کو بھی توجیہ کر کے اسی زندگی کے مطابق بنایا جائے گا، لیکن اگر اعتقادی اور عملی واخلاقی زندگی خود مبہم یا کھلے طور پر فاسد ہے تو ایسے شخص

کی موہم عبارتوں کو بلا توجیہ وتاویل اسی زندگی پر محمول کرلیا جاتا ہے کیونکہ توجیہ نہ کرنے کی صورت میں فسادِ عقیدہ ہی کا تو ایہام ہوسکتا ہے جس سے بچنے کیلئے توجیہات کی جاتی ہیں، لیکن جب وہ فساد خود ہی موجود اور واقع ہے تو ایہامِ فساد سے بچنا تحصیلِ لاحاصل ہے۔

منصور نے انا الحق کہہ دیا تو سب اس کی توجیہ کرکے اسے محمل حسن پر اس لئے اتارتے ہیں کہ منصور کی مجموعی زندگی ان کے نزدیک خدا پرستانہ اور فنائیت کی تھی، جس میں انائیت ونخوت کے لئے کوئی گنجائش نہ تھی، لیکن یہی انا جب فرعون کی زبان سے نکلا تو اس کے متبادر معنی میں کسی توجیہ وتاویل کی ضرورت اس لئے نہیں ہوئی کہ فرعون کی اعتقادی، صفاتی اور عملی زندگی خود ہی انائیت ونخوت اور کبر وغرور سے ہی بھری ہوئی تھی، اس لئے اس کا انا متبادر معنی کے ساتھ ہی اس کی زندگی کے مطابق اور اس پر چسپاں ہوسکتا تھا، کسی کو آٹے میں سے بال کی طرح نکال دینے کی تشبیہ توہین آمیز تشبیہ سمجھی جاتی ہے، اگر کسی باعزت آدمی کے لئے استعمال کرلی جائے تو اسے متبادر معنی کے لحاظ سے توہین پر محمول کیا جائے گا، اور قائل کو معاف نہیں کیا جائے گا۔ لیکن یہی تشبیہ بعینہٖ حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں استعمال کی، جب کہ قریش نے مسلمانوں کی ہجو میں انتہا کردی اور ان کی عورتوں تک کے چرچوں پر مشتمل اشعار گلی کوچوں میں گائے جانے لگے، تو حضرت حسانؓ نے کلمہ بہ کلمہ جواب دینے کے لئے قریش کی ہجو کا ارادہ کیا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں بھی تو قریش میں سے ہوں۔ عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! میں آپ کو اس طرح نکال دوں گا جیسے آٹے میں سے بال نکال دیا جاتا ہے۔ بلاشبہ اس تشبیہ کو توہین پر کبھی اس لئے محمول نہیں کیا جاسکتا کہ حضرت حسانؓ کی زندگی عشق ومحبتِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم میں چور اور بے پناہ عظمت وعقیدت کی حامل تھی، توہین کا کوئی منصوبہ کبھی بھی اس زندگی پر چسپاں نہیں ہوسکتا تھا۔ اس لئے اس جملہ کی توجیہ کی گئی کہ اس کلام سے تشبیہ مقصود نہ تھی بلکہ ہجو سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محض تنزیہ مقصود تھی، لیکن اگر یہی تشبیہی قول کسی ایسے شخص کی زبان سے ادا ہوتا جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت سے خالی ہوتا تو کون اس تاویل کی دردسری مول لیتا، آخر یہ کفار وفجار کی توہین آمیز عبارتیں اور تمسخر آمیز تشبیہیں رات دن سامنے آتی رہتی ہیں، کون ان کی

تاویل وتوجیہ کرتا ہے، احتجاج تو کیا جاتا ہے، تاویل نہیں کی جاتی، کیونکہ کہنے والے کی زندگی خود اپنے قول پر گواہ ہوتی ہے، تو اس کے قول کو اس کی زندگی سے کس طرح الگ کیا جا سکتا ہے؟

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک دن حمام کو بلایا دوسری طرف سے ایک امیر زادے نے پکارا، حجام نے امام کی صورت غریبانہ اور بوسیدہ لباس دیکھ کر التفات بھی نہیں کیا، اور یہ سمجھ کر کہ پیسے زیادہ امیر زادے سے ملیں گے، امیر زادے ہی کی طرف رخ کیا، اس نے مقررہ اجرت دیکر ٹال دیا۔ آخر میں امام صاحبؒ کی حجامت بنائی تو امام نے نہایت استغناء اور سیر چشمی سے چھ گنی اجرت جیب سے نکال کر اس کی طرف پھینک دی، اور یہ قطعہ پڑھا:

علیٰ ثیاب لو یُباع بمثلها بفلس لكان الفلس منهن اكثرا

فيهن نفس لويقاس ببعضها جميع الوریٰ كانت اجل واكبرا

ترجمہ: مجھ پر لباس وہ ہے کہ اگر اس جیسے لباس کو ایک پیسہ میں فروخت کیا جائے تو شائد ایک پیسہ بھی زائد ہی قیمت ہوگی، لیکن ان کپڑوں میں نفس وہ چھپا ہوا ہے کہ اس کے ایک حصے کو ساری دنیا کے ساتھ بھی تولا جائے تو یہ نفس ہی وزن دار اور بھاری نکلے گا۔

شعر انتہائی کبر ونخوت کے کلمات اور دعاوی پر مشتمل ہے لیکن امام کی کمالِ تواضع، ارفع ترین احوال اور انکسارِ نفس کی پاکیزہ زندگی کو سامنے رکھ کر ان کے اشعار کا مطلب یہ لیا جاتا ہے کہ یہ کبر نہ تھا صورتِ کبر تھی، جس سے مغرور امیر زادے کا غرور توڑنا اور حجام کے تحقیر آمیز رویہ پر کاری ضرب لگانا مقصود تھا، گویا یہ ایک اصلاحی قدم تھا تعلّی نہ تھی، لیکن اگر یہی کلام کسی مغرور اور متکبر انسان اور ایسے شخص کی زبان سے نکل جاتا جسے اپنے نام نہاد علم پر گھمنڈ اور اہل علم کی تحقیر وتوہین اس کا شیوہ ہوتا تو اس توجیہ کی ضرورت ہرگز نہ پڑتی، کلام کے وہی متبادر معنی لئے جاتے جو اس سے واضح ہوتے۔ بہر حال امامؒ کے اس موہم قول کا مطلب ان کی پارسانہ اور عارفانہ زندگی کو سامنے رکھ کر لیا گیا جس کی ضرورت کسی غیر پارسا اور غیر عارف کے لئے نہیں ہوسکتی۔

مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کا معاندینِ حق کو چیلنج

حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس سرہٗ نے جس زمانہ میں ''تحذیر الناس'' لکھی اور معاندین نے اس کی عبارتوں سے حضرت والا پر ختم نبوت کے انکار کا اتہام لگا کر تکفیر کا مشغلہ اختیار کیا، اسی زمانہ میں حضرت کو ریاست رام پور کا سفر درپیش آیا، جہاں ان عبارتوں پر چہ میگوئیاں زیادہ تھیں، اہل شہر کی درخواست پر مجمع عام پر تقریر منظور فرمالی، خبر دینے والوں کا بیان ہے، جو میں نے بعض مشاہدین کی زبان سے خود بھی سنا ہے کہ شہر کی عورتیں اور بچے تو شریک جلسہ نہیں ہوئے باقی مرد نام کا کوئی باقی نہ تھا جو شریکِ جلسہ نہیں ہوا۔ یعنی غیر معمولی اجتماع ہوا۔

حضرت والا نے ردِ فلسفہ وفلاسفہ پر تقریر شروع کی، جس نے مجمع کو کان علٰی رؤسھم الطیور بنا رکھا تھا، مگر باوجود انتہائی تواضع وانکسارِ نفس کے، جو اس زمانہ میں ضرب المثل بن گیا تھا، جوش میں فرمایا کہ:

''لوگ گھروں میں بیٹھ کر چہ میگوئیاں کرتے ہیں، اگر انہیں جرأت وہمت ہے تو میدان میں آئیں، مگر یہ سمجھ کر آئیں کہ وہ قاسم سے عہدہ برآ ہو کر نہ جائیں گے، خدا کی حجت تمام ہو چکی ہے۔''

کلام اپنے متبادر معنی کے لحاظ سے بظاہر انتہائی فخر وتعلّی اور اِدّعا کا پہلو لئے ہوئے تھا، مگر حضرت والا کی اس متواضعانہ اور منکسرانہ زندگی کو سامنے رکھ کر جو اس دور میں ضرب المثل ہوگئی تھی اور جس کے تحت وہ اپنے چھوٹوں سے بھی اس طرح پیش آتے تھے جیسے (یہ چھوٹے ان کے استاد اور بڑے ہیں) اس کلام کو الہامی دعویٰ اور من اللہ تحدّی پر محمول کیا گیا، نہ کہ کبر وغرور پر، کیونکہ کبر وغرور کے مضمون کو یہ زندگیاں برداشت ہی نہیں کرتی تھیں، اس لئے قول کو عملِ زندگی کے مطابق کرنے کے لئے اس کے وہی معنی لئے گئے جو اس زندگی پر چسپاں تھے۔ لیکن اگر یہی قول کسی متعصب اور گروہ ساز انسان کا ہوتا تو اس کی نفسیات واخلاق کے پیش نظر کسی تاویل کی ضرورت نہ تھی، متبادر معنی ہی پر کلام محمول کیا جاتا، کیوں کہ اس کی زندگی پر یہی معنی چسپاں ہو سکتے تھے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں ثلثِ کذبات والی حدیث کی توجیہ

یہی اصول ہے جس کی روشنی میں علماء وصلحاء ہی نہیں انبیاء علیہم السلام تک کے کلام کے محلوں کے بھی فیصلے کئے جاتے ہیں اوران کے متشابہ کلام کوان کے محکم کلام سے، اور محکم کلام کوان کی برگزیدہ زندگی کے پیمانہ سے ناپ کر پاک معنی اور محمل کا تعین کیا جاتا ہے، کیونکہ انبیاء علیہم السلام کے بارے میں ثلث کذبات کی حدیث سامنے آئی جو بظاہر ایک موہم کلام تھا، اوراس سے تبادر کے ساتھ ایک قبیح نسبت اور معصیت کا ایہام ذاتِ ابراہیمی کی طرف ہوتا تھا، اور وہ اس شان سے کہ ایک جلیل القدر پیغمبر دوسرے جلیل القدر پیغمبر کی طرف جھوٹ کی نسبت کر رہا ہے، جس سے دو پیغمبروں کی طرف معصیت کی نسبت ہورہی ہے، ایک کی طرف ''کہنے'' کی، اور دوسرے کی طرف ''ہونے'' کی، جو سرتا سراُن حضرات کی معصومیت کے منافی اور دل کو ہلا دینے والی نسبت ہے، لیکن قائلِ کلام سید المرسلین ہیں جن کا قلب مبارک تمام انبیاءِ سابقین اور بالخصوص ابراہیم علیہ السلام کی عظمت ومحبت سے لبریز ہے، جہاں توہینِ انبیاء تو بجائے خود ہے ایہامِ توہین بھی برداشت نہیں، ادھر مقول لہٗ (جن کے لئے یہ تین جھوٹ والا مقولہ کہا گیا) ابراہیم علیہ السلام ہیں، جن کے صدق واخلاص کو زمین وآسمان بھی پہچانتے ہیں، ان ہر دو صادق ومصدوق اور معصوم ہستیوں کی زندگی توہینِ انبیاء اور کسی قسم کی معصیت برداشت ہی نہیں کرسکتی تھی، جب کہ ان کی شریعتوں کا اہم ترین عقیدہ ہی بلا تفریق سارے انبیاء کی تصدیق وتعظیم، اور یہی تعظیم وتوقیر ان کی زندگیوں کا عملی نمونہ بھی ہے، تو علماء اس موہم کلام کی تحقیق اوراس کے صحیح محمل کو سامنے لانے کی طرف متوجہ ہوئے۔ کسی نے کہا کہ یہ کذب نہ تھا صورتِ کذب تھی جسے توریہ وتعریض کہتے ہیں اور یہ معصیت نہیں، اور جب کہ کسی دینی مصلحت کے منشاء سے ہو تو عینِ طاعت بھی ہے۔

حضرت نانوتویؒ بھی اس حدیث کی تحقیق کی طرف متوجہ ہوئے اور آپ نے تنزیہہ ابراہیمی

اور تنزیہہ نبویؐ کرتے ہوئے اپنے مخصوص حکیمانہ انداز میں کذب کی حقیقت اور اس کے شرعی حکم پر بھی روشنی ڈالی، جس کا حاصل یہ ہے کہ شریعت نے جہاں جھوٹ سے روکا اور اسے کبیرہ کہا ہے، وہیں بعض کذبات کی اجازت بھی دی ہے، حتیٰ کہ بعض جھوٹ کو واجب بھی بتلایا۔ اس سے واضح ہے کہ کلام غیر مطابقِ واقعہ فی نفسہٖ قبیح ہی نہیں، اس میں قبح اگر پیدا ہوتا ہے تو عوارض سے جس سے وہ حرام ہو جاتا ہے، جیسے حق تلفی، ضرر رسانی اور ظلم کی امداد وغیرہ، اور حسن آتا ہے تو عوارض سے، جس سے وہ مباح اور بعض اوقات واجب بن جاتا ہے جیسے اصلاحِ ذات البین، یا رفعِ ضرر دینی، یا کسی نفس معصوم کا قتل سے بچاؤ وغیرہ۔ اگر کذب (کلامِ خلافِ واقعہ) کسی ایذا رسانی یا حق تلفی وغیرہ پر مشتمل نہ ہو تو وہ فی نفسہٖ قبیح نہیں، ورنہ کبھی مباح و واجب نہ ہوتا، اس لئے ہر کذب علی الاطلاق معصیت نہیں اور غیر معصیت نبوت اور معصومیت کے منافی نہیں، اس لئے اگر ابراہیم علیہ السلام کے ان کذبات کو حقیقی معنی میں بھی کذب ہی کہا جائے تب بھی وہ معصیت نہیں ہو سکتے کہ اس قسم کے کلام میں معصیت کی شان ذاتی نہیں بلکہ ضرر رسانی و حق تلفی وغیرہ کے عوارض سے پیش ہوتی ہے نہ کہ نفسِ کلام سے، اور حق تلفی و ضرر رسانی وغیرہ کا ابراہیم علیہ السلام میں وجود تو کیا ہوتا امکان بھی نہ تھا، اس لئے یہ کذب باوجود کذب ہونے کے بھی معصیت نہ ہوا، جو ان کی شانِ تقدس پر دھبہ بنتا اور جب کہ اس میں بہت سے دینی مصالح بھی پیش نظر تھے، جیسے اپنے کو اور مخلوقِ خدا کو دینی اور روحانی مضرتوں اور معصیتوں سے بچا لینا، تو اس صورت میں یہ کلام اوپر سے طاعت و عبادت بھی ہو گیا، جس سے حضرت نانوتوی قدس سرہٗ نے واضح فرمایا کہ کلام خلافِ واقعہ علی الاطلاق معصیت ہے ہی نہیں کہ منافیٔ نبوت و عصمت ہو، اس میں عوارض سے دونوں شانیں آجاتی ہیں، معصیت کی بھی اور طاعت کی بھی۔

اس لئے جس کی زندگی جیسی ہوگی ویسے ہی عوارض اس کے اس نوع کے کلام کے محمل کا فیصلہ ہوگا، ابراہیم علیہ السلام خود پاک، ان کی زندگی پاک، ان کے عقائد پاک، تو ان کا یہ کلام جس پر کذب کا اطلاق کیا گیا یقیناً اس زندگی کے مطابق ہونے کی وجہ سے پاک اور غیر معصیت ہوگا۔

سچ ہر موقع پر قابلِ مدح نہیں

بہرحال عوارض میں تبدیلِ ماہیت کی صلاحیت ہے، غیبت تو کلامِ صادق کو کہتے ہیں جس میں پسِ پشت کسی کا واقعی عیب بیان کیا جاتا ہے، لیکن فتنہ انگیزی کی وجہ سے یہ سچ شدید معصیت بن جاتا ہے۔ اگر اس میں سے فتنہ ہونے کی شان نکل جائے جیسے توہین ورسوائی کے بجائے ایک صاحبِ معاملہ اپنے معاملہ دار کی حق تلفیاں اپنے کو مظلومیت سے چھڑانے کے لئے بیان کرے، تو یہ فتنہ نہیں، اس لئے یہ عیب ہی نہیں یا ہے تو جائز ہے۔

اسی نوع کا ایک فرد اسماءِ رجال کے سلسلہ میں رواۃ پر جرح وقدح کیا جانا بھی ہے جس میں ان کے ضبط وعدالت کی کوتاہی وغیرہ بیان کی جاتی ہے، اسلئے یہ عیب نہیں اور جبکہ اس سے دین کی حفاظت مقصود ہے، تذلیل مقصود نہیں، اسلئے یہ عبادت بھی ہے، لیکن یہ سارا قصہ صحابہؓ کے بعد کے طبقات کیلئے ہے، صحابہ کے بارے میں امتِ مرحومہ کا اجماع ہے کہ وہ کل کے کل متقن اور عدول ہیں، اسی لئے محدثین کے یہاں صحابہ رضی اللہ عنہم کو متنِ حدیث میں رکھا جاتا ہے جو تنقید سے بالاتر ہے۔

حاصل یہ ہے کہ کلام مطابقِ واقعہ وغیر مطابقِ واقعہ کی یہ تفصیلات حضرت نانوتوی قدس سرہٗ نے کذباتِ ابراہیم علیہ السلام کے سلسلہ میں تنزیہہ ابراہیمی کے لئے کیں، تاکہ اس کلام سے کسی قبیح نسبت کا ایہام ذاتِ ابراہیمی کی طرف نہ ہو، اور کذباتِ ابراہیم کا وہی محمل حسن سامنے آجائے، جو ابراہیمی زندگی کے حسبِ حال ہو۔

اسماء وصفات بھی ذات وحیات کے لحاظ سے منطبق ہوں گے

عبارت یا کلام ہی پر منحصر نہیں، اسماء وصفات کے اطلاق میں بھی یہی صورت ہے کہ جیسی ذات اور حیات، ویسے ہی اس کے اسماء وصفات کے معانی، جس قدر بھی انسانی اعضاء ہیں تقریباً سب کے سب ذاتِ بابرکاتِ حق پر اطلاق کئے گئے ہیں، ہاتھ، قدم، چہرہ، آنکھ، کوکھ، پنڈلی وغیرہ جیسے انسان کے لئے ثابت ہیں، ویسے ہی اللہ کے لئے ثابت ہیں، لیکن کیا اللہ کی ذات میں ان الفاظ کے وہی

معنی لئے جائیں گے جو انسان میں لئے جاتے ہیں؟ نہیں! بلکہ جیسی ذات وحیات ویسے ہی ان الفاظ کے معانی وحقائق اور تمام وہ صفات (بجز صفاتِ خاصہ) جو اللہ کے لئے ثابت ہیں بندوں کے لئے بھی بولی گئی ہیں، سمیع، بصیر، رؤف، رحیم، کریم، حافظ، حفیظ، مومن، رقیب وغیرہ لیکن جو فرق بندے اور خدا میں ہے وہی ان کے معانی میں بھی ہے، جو احوال بندوں پر آتے ہیں، وہ خدائے برحق کے لئے بھی بولے گئے ہیں، عروج ونزول، ہنسی مذاق، قرب وبعد، خوشی ناخوشی، رضا وناراضائی، گرمی وٹھنڈک، سرگوشی واعلان، وصل وملاپ، محبت وعداوت، لڑائی صلح وغیرہ، لیکن کیا اس اسمی اشتراک کی وجہ سے دونوں جگہ ان الفاظ اور اطلاقات کے ایک ہی معنی ہوں گے؟ ہرگز نہیں! بلکہ یہ الفاظ جب خدائے عزاسمہٗ پر بولے جائیں گے تو اس کی شانِ ارفع واعلیٰ اور حیاتِ بے چون وبے چگون کو سامنے رکھ کر ان الفاظ کے معنی وہ لئے جائیں گے جو اس کی شانِ تنزیہہ کے مناسب ہوں، لیکن جب بندوں پر بولے جائیں گے تو متبادر معنی میں کسی توجیہ وتاویل کی ضرورت نہ ہوگی، کیوں کہ بندے کی زندگی میں اس شان کی کوئی تنزیہہ ہے ہی نہیں جو بے چون وچگون ہو، اور ان الفاظ کی توجیہ وتاویل کی ضرورت پڑے۔

بہر حال یہ اصول کہ ہر شخص پر بولے جانے والے کلمات کے معنی اس شخص کی زندگی کو سامنے رکھ کر لئے جائیں، ایک سائنٹفک اور قدرتی اصول ہے جس سے شریعت اور عرف دونوں نے کام لیا ہے، اور یہ اصول بندہ اور خدا دونوں ہی کے لئے استعمال ہوتا رہا ہے۔

حضرت نانوتویؒ کے کلمات کو محمل حسن پر محمول کرنے کی وجہ

اس اصول کے سامنے آجانے کے بعد اگر علمائے دیوبند نے حضرت حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس سرہٗ کے ان کلمات کو توجیہ وتاویل کر کے بھی محملِ حسن پر اتارنا چاہا جن کو مخالفین نے برے محمل پر محمول کر لیا تھا تو یہ کوئی تعصب یا گروہی جذبہ نہیں، بلکہ اصولِ مذکورہ کی روشنی میں ان

کا دینی فرض تھا کہ وہ ایسا کرتے کہ انہوں نے عبارت ہی کونہیں دیکھا بلکہ عبارت والے کی زندگی کو بھی دیکھا، جس میں ان برے عقائد کے لئے کوئی گنجائش ہی نہ تھی، جن کو مخالفین نے ان کی طرف منسوب کر کے ان کی عبارتوں کو ان محملوں پر حمل کیا تھا۔ اس لئے حضرت کی عبارات کے وہ معنی نہیں لئے جن کو ان کی اعتقادی، اخلاقی اور حالی وقالی زندگی خود دفع کر رہی تھی، اگر خدانخواستہ حضرت والا کی وہ زندگی نہ ہوتی تو پھر بلاشبہ ہمیں کسی توجیہ وتاویل کی حاجت نہ تھی، پھر بھی اگر تاویل کی جاتی تو وہ تعصبِ محض ہوتا۔

پس حضرت کے کسی مبہم یا موہم قول کی توجیہ وتاویل درحقیقت تاویل ہی نہیں بلکہ ان کی زندگی سے ان کے قول کی تفسیر ہے جو فی نفسہٖ معقول اور قدرتی ہے۔

مولانا مودودی کی عبارات وکلمات کو محمل حسن پر نہ اُتارنے کی وجہ

لیکن مولانا مودودی صاحب کی وہ عبارتیں جن سے متبادر مفہوم کے لحاظ سے صحابہ یا ائمہ یا علماء وصلحاء کا استخفاف نکلتا ہے جب سامنے آئیں گی تو وہ بھی اُس اصول پر پرکھی جائیں گی، جن پر ہم سلف وخلف کی عبارتوں کو کستے چلے آرہے ہیں۔

مودودی لٹریچر میں صحابہ کرام اور اسلافِ امت کی توہین وحرف گیری

مودودی لٹریچر میں صحابہ، تابعین، ائمہ مجتہدین، علمائے راسخین اور اولیاءِ متقین کے بارے میں ان کی غلطیاں پکڑنے اور نقد وتبصرہ کی توہین آمیز عبارتیں بلاشبہ موجود ہیں جن کی توجیہ وتاویل کی خود انہیں بھی مدافعت کے طور پر ضرورت محسوس ہوتی رہتی ہے۔ مثلاً صحابہ کرام کے بارے میں مودودی

صاحب نے تحریروں میں کہا ہے کہ:

''صحابہ پر بسا اوقات بشری کمزوریوں کا غلبہ ہو جاتا تھا اور وہ ایک دوسرے پر چوٹیں کر جاتے تھے۔ ایک دوسرے کو جھوٹا کہہ جاتے تھے۔''

اور یہ کذب کی نسبت چونکہ نقد و تبصرہ اور جرح کی مد میں کر رہے ہیں جیسا کہ بشری کمزوریوں کا عنوان اس کا شاہد عدل ہے، اس لئے اس لفظ کو تعدیل پر بھی محمول نہیں کر سکتے، کہ ثلثِ کذبات والی حدیث کے مطابق یہاں بھی کذب کو کسی توریہ یا تعریض پر محمول کر لیا جائے، اس لئے مودودی صاحب کے زعم کے مطابق یہ وہی کذب ہو سکتا ہے جو آدمی کو مجروح کر دیتا ہے۔ پس بمدِ جرح آپ نے بشری کمزوریوں کے عنوان سے صحابہ کی طرف کذب کو منسوب کیا اور وہ بھی اس شان سے نہیں کہ بشری کمزوریاں احیاناً یا اتفاقاً ہی ان سے سرزد ہو جاتی تھیں بلکہ ''بسا اوقات'' کے لفظ سے یعنی اکثر و بیشتر ایسا ہوتا تھا، پھر بسا اوقات بھی محض ان کمزوریوں کا صدور ہی نہیں ہو جاتا تھا بلکہ ان کا غلبہ بھی ہوتا تھا، جس سے مغلوب ہو کر گویا وہ ان کمزوریوں سے رک جاتے تھے اور معاذ اللہ وہ عام اتقیاءِ امت جیسے بھی نہ تھے کہ:

اِنَّ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا اِذَامَسَّھُمْ طَآئِفٌ مِّنَ الشَّیْطَانِ تَذَکَّرُوْا فَاِذَا ھُمْ مُّبْصِرُوْنَ ٥

(سورہ اعراف:۲۰۱)

ترجمہ: جو لوگ تقویٰ اختیار کرتے ہیں جب انہیں شیطان کی طرف سے کوئی برائی پہنچتی ہے تو وہ چونک اٹھتے ہیں اور پھر بصیرت سے کام لیتے ہیں۔

ہی کے مصداق بن جاتے۔

ان عبارتوں کے متبادر معنی محض تنقید کے نہیں، بلکہ توہینِ صحابہ کے ہیں جو یقیناً کلام کا ایک برا محل ہے۔ مسلمانوں نے اس پر شور مچایا اور مودودی صاحب کی ان عبارتوں کو گمراہی اور گمراہ کن بتلایا تو مودودی حضرات کو شکایت ہوئی کہ اگر ان عبارتوں کا کوئی محملِ حسن لے لیا جاتا تو تمہارا کیا نقصان ہو جاتا؟ مثلاً یہی تاویل کر لیتے کہ اس عبارت سے کوئی نکتہ چینی یا توہین مقصود نہ تھی صرف بیانِ حال اور تاریخی طور پر ایک حقیقت کا اظہار پیش نظر تھا، جیسے اخباروں میں مراسلات کے عنوان کے نیچے لکھ دیا جاتا ہے کہ:

''ایڈیٹر کا نامہ نگاروں کے رائے سے متفق ہونا ضروری نہیں''

یعنی محض خبر کی اشاعت مقصود ہے کسی کی ہمنوائی مقصود نہیں، گو بشری کمزوریوں کے لفظ کے بعد یہ تاویل اس عبارت میں چل نہیں سکتی تھی، لیکن ہم نے اس سے قطع نظر کر کے ان کی اس قسم کی عبارتوں کو اسی اصول پر جانچا کہ ہر شخص کے کلام کا مطلب اس کی مجموعی زندگی اور اعتقادی و اخلاقی حیات کو سامنے رکھ کر لیا جانا چاہئے۔ سو ہم نے دیکھا کہ اس کا بنیادی عقیدہ اور دستوری اصولِ موضوعہ یہ ہے کہ:

''رسولِ خدا کے سوا کسی کو معیارِ حق نہ بناؤ۔''

اس عقیدہ سے تو مودودی حضرات اور تمام صحابہ رسولِ خدا سے اخذ کرنے اور براہِ راست اپنے کو اس معیارِ کامل پر پرکھنے میں مساوی درجہ میں آئے اور انہیں کوئی مجبوری نہ رہی کہ وہ صحابہ کے آگے جھکیں یا ان کی بات بلا چون وچرا مان لیں۔

پھر اسی عقیدہ کا دوسرا اصولی جزو یہ ہے کہ:

''رسولِ خدا کے سوا کسی کو تنقید سے بالاتر نہ سمجھو۔''

اس اصول سے انہیں صحابہ پر تنقید وتبصرہ اور ان کی خطائیں پکڑنے اور ان کے خطا وصواب پر حکم لگانے کا حق ملا، ظاہر ہے کہ ان دو اصولوں کے بعد صحابہ پر ان کی تنقید محض نامہ نگار کی رائے یا کوئی تاریخی نظریہ کی حد تک نہیں رہتی جس کے حق میں انہیں محض ناقل کہہ کر ان کی ان تنقیدی عبارتوں کی تاویل کر لی جائے، بلکہ حقیقی معنی میں تنقید ثابت ہوتی ہے جو انہوں نے شرما کر نہیں کی بلکہ اپنے اصول کے مطابق ایک جائز حق سمجھ کر کی، اور مساویانہ انداز سے کی، کیونکہ معیارِ کامل کے سامنے مودودی حضرات اور صحابہ برابر کے درجہ کے افراد تھے۔

پھر اسی عقیدے کا تیسرا جزو یہ ہے کہ:

''رسولِ خدا کے سواء کسی کی ذہنی غلامی میں مبتلاء نہ ہو۔''

اس اصول پر نہ صرف یہ کہ وہ صحابہ کے مساوی ہو گئے تھے اور انہیں تنقید کا حق ہی مل گیا تھا، بلکہ ان سے مستغنی بھی ہو گئے، اور نہ صرف استغناء و یکسوئی بلکہ لفظِ ابتلاء سے یہ بھی واضح کر دیا گیا کہ یہ ذہنی غلامی ایک ابتلاء اور روگ بھی ہے جس کا کاٹ ڈالنا ضروری ہے۔ اس صورت میں مساویانہ تنقید

سے گذر کر انہیں یہ بھی حق مل گیا کہ وہ اس روگ کا مادہ ختم کرنے کے لئے تنقید کا جس قسم کا بھی لب و لہجہ اور اندازِ تنقید اختیار کریں کر سکتے ہیں۔ جب وہ صحابہ کے دبیل (دبے ہوئے، احسان مند) نہیں ،ان سے مستغنی بھی ہیں، ان کی برابری بھی ہے اور ان کی غلطیاں بھی پکڑ سکتے ہیں، تو اس صورت میں جو بھی صحابہ کی غیر معمولی عظمت بیان کر کے ان کی ذہنی غلامی پر زور دے گا، تو روافض کی طرح اس کا ردِعمل یہی ہوگا کہ ان پر تیز لفظوں میں تنقید و تبرا گوئی سے کام لیا جائے اور اس غیر معمولی عظمت و توقیر کے مقابلہ میں تحقیر و بیزاری کا اظہار کیا جائے تا کہ یہ ذہنی غلامی کا روگ اور ان حضرات سے دلوں کی مرعوبیت کا مادہ ختم ہو۔

اس بناء پر اگر غلامانِ صحابہ نے یہ کہا کہ صحابہ سب کے سب بلا استثناء متقن اور عدول ہیں، لہٰذا ان کی روایت و درایت پر کلی اعتماد کرو تو ادھر سے ردِعمل یہ ہوا کہ انہیں تو جھوٹ بولنے سے بھی گریز نہ تھا، اور ان پر تو بشری کمزوریوں کا غلبہ بھی ہو جاتا تھا، وہ تو ایک دوسرے پر جذباتی چوٹیں بھی کر جاتے تھے، گویا وہ خود ہی ایک دوسرے کی عظمت نہیں کرتے تھے، تو تم کیوں اس ذہنی غلامی اور مرعوبیت کے روگ میں گرفتار ہو رہے ہو، تم ان کا واسطہ چھوڑ کر براہِ راست معیارِ کامل پر اپنے کو کیوں نہیں پرکھتے۔

مولانا مودودی کے اصول وعقائد ان کے کلام میں تاویلات کے لئے سدِ راہ

بہرحال مودودی حضرات نے اپنے ان اصولِ سہ گانہ کی روشنی میں اگر صحابہؓ پر اسی انداز سے زبان کھولی جس انداز سے وہ اپنے دور کے کسی مولوی پر کھول سکتے تھے، اور کافی کھولی تو وہ اپنے عقیدہ کی رو سے مطمئن ہیں کہ انہوں نے صحابہؓ پر لے دے کر کے ان پر توہین آمیز لہجہ میں تنقید کر کے اور ان پر طنز آمیز انداز سے جھوٹ بولنے کا اتہام لگا کر کوئی برا کام نہیں کیا، کہ اسکی تاویل کی جائے۔

پس ان کی ان عبارتوں کے متبادر معنی اگر توہینِ صحابہ کے ہیں تو ان میں تاویل کی گنجائش یوں نہیں رہتی کہ جب ان کا مطلب مودودی حضرات کی اس اعتقادی اور اخلاقی زندگی ہی کو سامنے رکھ

کرلیا گیا تو ان اصول وعقائد نے ان میں تاویل کی کوئی گنجائش نہیں چھوڑی، بلکہ اس توہین وحرف گیری کواور اصولی شکل دیدی، جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی مارمر کے کچھ تاویل کر بھی لے تو اسے یہ اعتقادی زندگی خود رَد کردے گی۔ اس لئے ہم نے اگر مودودی صاحب کی ان عبارتوں کی تاویل نہیں کی تو یہ ہمارا قصور نہیں، انہوں نے اپنے اصول کی رو سے خود نہیں چاہا کہ ان عبارتوں میں تاویل کی جائے۔ اگر وہ یہ چاہتے کہ ان عبارتوں کا محمل توہینِ صحابہ نہ لیا جائے بلکہ انہیں مدحِ صحابہ پر محمول کیا جائے تو وہ اپنے اس بنیادی عقیدہ میں پہلے خود ترمیم کرتے، اور اس بنیادی دفعہ کا محملِ حسن ظاہر کردیتے، تو ان جزوی عبارتوں کا محملِ حسن خود ہی پیدا ہوجاتا۔ پس جو چیز آپ اپنے بارے میں خود نہیں چاہتے اس کا مطالبہ دوسروں سے کیوں کرتے ہیں؟ وہ دوسرے غریب آخر کریں کیا جب کہ انہیں کسی تاویل کا راستہ ہی نہ دیا جائے، ورنہ یہ تو ''مدعی سست گواہ چست'' کی سی مثال ہوجائے گی۔

اس لئے مناسب ہوگا کہ اس شکوہ کا رخ علمائے دیوبند سے پھیر کو مودودیت کی طرف کردیا جائے، اگر مقالہ نگار صاحب کی شنوائی ہوگئی تو ہم نیازمند بھی حاضر ہیں ورنہ یہ موجودہ صورتِ حال کے رہتے ہوئے اگر مقالہ نگار ہم سے مودودی صاحب کی ان عبارتوں میں تاویل اور محمل نشانی ہی کا مطالبہ کریں گے تو یہ **توجیہ القول بما لا یرضٰی به قائله** کا مصداق ہوگا جس سے آپ خود بھی گریزاں ہیں۔

بہرحال اصولی طور پر حضرت حجۃ الاسلام مولانا نانوتوی قدس سرہٗ کی عبارتوں پر قیاس کرکے مولانا مودودی کی عبارتوں کی تاویلِ حسن کا مطالبہ کرنا قیاس مع الفارق ہے۔ حضرت نانوتوی کی عبارتیں ان کے کلام میں ان ہی کی اعتقادی، اخلاقی اور صفاتی زندگی کے مطابق معنی اور محمل چاہتی ہیں اور مولانا مودودی کی عبارتیں ان ہی کی اعتقادی، اخلاقی اور عملی زندگی کے مطابق معنی کی متقاضی ہیں، ہم ہر ایک کے اعتقاد اور اصول کو سامنے رکھ کر ہی اس کے کلام کا مطلب سمجھتے ہیں، خواہ وہ ''جلد بازی'' کا مسئلہ ہو، یا ''قلتِ تفکر'' کا، ''ختم نبوت'' کا ہو، یا ''توہینِ انبیاء'' کا، ان مسائل میں ہر قائل نے اپنی جزئیات کا مطلب اپنے اصول واعتقاد سے خود بیان کردیا ہے، اس لئے اس کے خلاف مطلب لینا بلاشبہ ''**توجیه القول بما لا یرضٰی به القائل**'' کے نیچے آجائے گا جس سے

بچنا مقالہ نگار صاحب کے نزدیک بھی ضروری ہے۔

مقالہ نگار صاحب کا یہ سوال اٹھانا کہ آیا موسیٰ علیہ السلام کی طرف ''جلد بازی'' کی نسبت کرنے سے ان کی توہین کا پہلو پیدا ہوتا ہے، جو مولانا مودودی نے کی ہے، یا ''قلت تفکر'' کی نسبت سے توہین نکلتی ہے، جو حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے کی ہے وہی ''**توجیہ القول بما لا یرضٰی به قائله**'' کی راہ چلنا ہے، جس سے وہ دوسروں کو روک رہے ہیں۔ کیونکہ سوال یہ نہیں ہے کہ ان میں سے کونسی نسبت سے توہینِ موسوی نکلتی ہے اور کونسی سے نہیں، یا ان میں سے کون سے کلمہ سے موسیٰ علیہ السلام کی معاذ اللہ فروگذاشت زیادہ ثابت ہوتی ہے اور کون سے کلمہ سے کم، یہ کوئی توہین کے میدان کی گھوڑ دوڑ نہیں ہے کہ معاذ اللہ انبیاء کی فروگذاشت کے سلسلہ میں آگے بڑھنے یا پیچھے رہ جانے والوں کا مقابلہ یا موازنہ کر کے ان کے خطاء وصواب کے درجات قائم کئے جائیں۔

اس لئے یہ سوال ہی بے محل ہے کہ ان میں سے کونسے کلمہ سے توہین کا پہلو نکلتا ہے اور کونسے سے نہیں، سوال یہ ہے کہ کس کے یہاں نبی سے فروگذاشتوں، کوتاہیوں اور بشری کمزوریوں کا صدور عقیدہ کی رو سے ممکن ہے اور کس کے یہاں نہیں۔

ظاہر ہے کہ جو شخص یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ نبی سے گہہ وبے گہہ حفاظتِ خداوندی اٹھالی جاتی ہے گویا عصمت کسی وقت اس سے منفک اور جدا بھی ہوجاتی ہے، جو نبی کو کمزوریوں اور معصیتوں سے بچائے ہوئے تھی، تو یقیناً اس کے نزدیک کوتاہیٔ معصیت بھی سرزد ہوسکتی ہے، جبکہ محافظ دستہ ہی پاس موجود نہ رہا، سو ایسے شخص کی عبارت میں اگر موسیٰ کو ''جلد باز'' کہا گیا ہے تو اسے کیا مجبوری ہے کہ وہ لوگوں کے شور مچانے پر اس میں دین کی قید بڑھا کر براہِ تاویل یوں کہے کہ نیکی کے کام میں یا امر الٰہی کو پورا کرنے میں جلد بازی کونسا گناہ ہے، اسے تو ان شور مچانے والوں کی تحمیق کرتے ہوئے یہ کہنا چاہئے تھا کہ جلد بازی تو عرفی ہی گناہ ہے، اگر موسیٰ علیہ السلام سے کوئی شرعی گناہ بھی (معاذ اللہ) سرزد ہوجاتا تو کیا حرج تھا، کیونکہ ممکن ہے کہ اس وقت ان سے حفاظتِ خداوندی اٹھالی گئی ہو، جو گناہ اور پیغمبر کے درمیان میں حائل ہوتی ہے۔

تاویل کی ضرورت تب ہے جب کلام صاحبِ کلام کی عملی زندگی اور اصول کے خلاف ہو

بہر حال تاویل کی ضرورت تو جب تھی کہ عبارت کا مضمون عقیدہ کے خلاف ہوتا، جب سرتاسر عقیدہ کے موافق اور اس کا مؤید ہے تو تاویل کے معنی خود ایسے عقیدہ کو جھٹلانے کے ہو جاتے ہیں۔ لیکن جس شخص کا عقیدہ یہ ہو کہ انبیاء علیہم السلام کی نبوت کے لئے عصمت لوازمِ ذاتیہ میں ہے، اگر نبوت نبی سے کسی وقت جدا نہیں ہو سکتی تو عصمت اور حفاظتِ خداوندی بھی ایک لمحہ کے لئے پیغمبر سے جدا نہیں ہو سکتی، اس لئے نبی ہر گناہ سے، صغیرہ ہو یا کبیرہ، ہر وقت بری اور منزہ ہے، ایسے شخص کی کسی عبارت میں بقول جناب، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف ''قلت تفکر'' کی اگر کہیں نسبت ہو جائے تو یقیناً محتاجِ تاویل ہوگی، درحالیکہ حضرت نانوتویؒ کی کسی عبارت میں موسیٰ علیہ السلام کی طرف قلت تفکر کا انتساب نہیں کیا گیا وہ تو عام افراد کا ذکر کرتے ہوئے یہ فرمارہے ہیں کہ اکثر آدمی بوجہ قلت تفکر بعض غیر منصوص امور کو منصوص سمجھ جاتے ہیں، آگے اور تو اور کے لفظ سے ترقی کر کے فرمارہے ہیں کہ ایسی فکری خطا بڑے سے بڑے سے ممکن ہے۔ موسیٰ علیہ السلام بھی واقعاتِ خضر کے سلسلہ میں ایسا سمجھ گئے۔ کیوں سمجھ گئے؟ آیا قلتِ تفکر اس کی بناء تھی یا خطاء اجتہادی، اس سے حضرت کی عبارت ساکت ہے۔ اس میں قلت تفکر کو موسوی فعل کی علت قرار دے کر اسے حضرت کے کلام کی طرف منسوب کرنا ان کی عبارت پر ایک اضافہ ہے۔ اگر صاحبِ عبارت کی طرف سے ہمیں اس فعلِ موسوی کی علت میں تعیین کا اختیار دیا جائے تو ہم موسوی زندگی کے مناسبِ حال ان کے اس فعل کی علت خطاء اجتہادی سمجھیں گے جس میں قلتِ تفکر نہیں قوتِ تفکر پورا کام کرتی ہے، لیکن اگر برسبیلِ فرض ان کے کسی کلام میں ایسی نسبت پائی بھی جاتی تو اس کی توجیہ اس لئے ضروری ہوتی کہ یہ نسبت ان کی عام اعتقادی واخلاقی زندگی کے منافی ہے۔

اس صورتِ حال کو سامنے رکھتے ہوئے مودودی صاحب کا ''جلد باز'' کے لفظ میں جو صریح

عبارت میں ہے، تاویل کرنا تو اپنے اصول کو جھٹلانا ہے، اور حضرت کے کلام میں قلتِ تفکر کے لفظ میں (بالفرض اور وہ پایا جاتا) تاویل کیا جانا، ان کے اصول کے ساتھ ہم آہنگی کرتا ہے جو اصولاً ضروری ہے۔

اب موازنہ کرنے والے موازنہ کریں کہ نبی کیلئے عصمت اور حفاظتِ خداوندی ہمہ وقت لازم نہ سمجھنے والے اور ان کے حق میں گہہ وبے گہہ کوتاہی یا معصیت جائز رکھنے والے توہینِ انبیاء کے مرتکب ہیں یا انبیاء علیہم السلام کو علی الاطلاق معصوم اور ہر نوع کی معصیت سے بری سمجھنے والے توہینِ انبیاء کے مرتکب ہیں، بلاشبہ مقالہ نگار صاحب ہی کے بقول ''یہ سب کچھ غور وفکر کا سخت تقاضا کر رہا ہے'' اور اب میں ان ہی کے الفاظ میں خفیف سے تغیر کے ساتھ عرض کروں گا کہ:

''مولانا (نانوتویؒ) کی کوئی سی عبارت جس سے توہین انبیاء آپ حضرت اخذ کرتے ہیں اور جلسوں اور پمفلٹوں اور 'دعوت' اخبار وغیرہ کے ذریعہ اس کی اشاعت وتشہیر کرتے ہیں، اپنے ان بنیادی اصولوں اور ان کے تحت ان کی مثالوں کے برابر رکھ کر دیکھئے کونسی بات قابلِ شکوہ ہی نہیں، قابلِ حذف ہے، اور کس بات سے فتنہ سامانی زیادہ کی جاسکتی ہے؟ ذرا سوچئے مولانا (نانوتویؒ) کی عبارتوں کو سامنے رکھ کر تیر اندازی کا یہ طرزِ عمل دینداری اور تقویٰ (بلکہ ایمان واسلام) سے کس طرح میل کھاتا ہے اور سمجھنے اور سوچنے والے طبقہ میں آپ کا وزن کس قدر بڑھ رہا ہے؟''

بہرحال یہ جزئی ہو یا اور جزئیاتی عبارتیں ہوں جن کی آپ کے یہاں کمی نہیں، آپ کا ان جزئیات میں پناہ لینا کہ اگر مولانا مودودی نے ایسا کہا تو فلاں بزرگ نے بھی تو ایسا کہا ہے (بشرطیکہ اس بزرگ نے کہا ہو) اس مثل کا مصداق ہے کہ: ع

''این گناہیست کہ در شہر شما نیز کنند''

یہ عذرِ گناہ نہیں بدتر از گناہ ہے، جو نہ گناہ کا تدارک ہے نہ اُس پر غور کی کوشش، یہ صورتِ حال اکثر اس وقت پیش آتی ہے جب کسی فعل پر کوئی صریح حجت نہ لائی جاسکتی ہو، تو آدمی کسی مسلّمہ بڑے کے فعل کے دامن میں اپنے کو چھپا کر جان چھڑانے لگے، لیکن یہ عمل تعصب اور اس کے ساتھ کمزوری کا کہلاتا ہے، کیوں کہ اس میں بسا اوقات اپنی جان چھڑانے کی خاطر اس بڑے کی طرف غلط چیزیں بھی منسوب کر دی جاتی ہیں، نیز یہی صورت محملِ حسن کے مطالبہ کی بھی ہے، تعیینِ محمل کا تعلق بھی

اصول وعقائد کی پوری زندگی سے ہے، جسے خالی جزئیات سے چاہا جارہا ہے۔

آپ شکایت فرمارہے ہیں جزئیات سامنے رکھ کر، کہ فلاں جزئی کا محملِ حسن کیوں نہ پیدا کرلیا گیا، اور فلاں کی تاویلِ حسن کیوں نہ کرلی گئی، اور ہماری نظر ان اصولوں پر ہے جس سے نکل نکل کر یہ جزئیات سامنے آرہی ہیں اور ان اصول نے ان جزئیات میں سما کر ایک ایسا رنگ پیدا کردیا ہے جو کسی بھی تاویل کو پاس پھٹکنے نہیں دیتے، اس لئے یہ اصول بدلیں تو جزئیات بدلیں ورنہ محض پتوں کو پانی سے دھوڈالنے سے ان کا نوعی اور اصولی رنگ کیسے دھل جائے گا۔ ان مثالی جزئیات میں سب سے زیادہ اہمیت کے ساتھ جس جزئی کو یہ کہہ کر پیش کیا گیا ہے کہ وہ ایک رازِ سربستہ تھا جو اَب تک پیش کرنے والوں ہی تک محدود تھا، اور جو محض عبرت آموزی کے لئے بطور عملی ثبوت کے کھولا جارہا ہے، نہ دارالافتاء دارالعلوم دیوبند کا وہ فتویٰ ہے جس میں خود بانئ دارالعلوم کی ایک عبارت پر تکفیر کردی گئی ہے، اس فتویٰ سے ''معروضات میں عملی ثبوت'' کے طور پر بہت ہوشیاری کے ساتھ پھندا یہ رکھا گیا ہے کہ اگر اسی طرح کی عبارتوں پر مولانا مودودی کی تضلیل کردی گئی ہے تو اس طرزِ عمل سے کون بچ سکتا ہے۔ دیکھئے حضرت مولانا نانوتویؒ کی بھی اسی قسم کی عبارتوں پر خود ان کی جماعت ہی نے تکفیر کردی ہے۔ اب اگر حضرت کی اس ''تصفية العقائد'' والی عبارت میں سیاق وسباق سے مدد لے کر کوئی تاویل کی جائے تو مولانا مودودی نے کیا قصور کیا ہے کہ انہیں اس تاویلِ حسن سے نہ نوازا جائے اور ان کے سیاق وسباق کو بالکل ہی نظر انداز کردیا جائے، اور اگر حضرت نانوتویؒ کے بارے میں تکفیر کو غوغائے عوام یا غلط فہمی خواص سمجھ کر نظر انداز کردیا جائے تو مولانا مودودی بھی اسکے مستحق ہیں کہ ان کی تضلیل کو بھی غوغائے عوام یا غلط فہمی خواص سمجھ لیا جائے۔

لیکن میں عرض کرچکا ہوں کہ یہ ''عملی ثبوت'' اس وقت کارآمد ہوسکتا ہے جب دونوں کا مقدمہ ایک ہو، اور معاملہ کی نوعیت واحد ہو، حالانکہ میں عرض کرچکا ہوں کہ دونوں کے معاملات میں جزوی ہی نہیں بلکہ اصولی فرق ہے۔ اگر ایک شخص کی عبارت توہین آمیز ہو، اور اس کے یہاں توہین اصولاً واعتقاداً جائز بھی ہو تو وہاں عبارت کی توجیہ وتاویل یا سیاق وسباق کی مدد کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، یہ سوال تو صرف اس صورت میں ہوسکتا ہے کہ عبارت سے توہین کا وہم ہوتا ہو اور صاحبِ عبارت کا

اعتقاد اور اصول حرمتِ توہین کا ہو، تو سیاق وسباق سے دیکھنے کی مجبوری لاحق ہوگی کہ فلاں شخص نے خلافِ عقیدہ ایسی عبارت کیوں لکھدی؟ ضروری ہے کہ اس کی عبارت میں کوئی نہ کوئی لفظ ایسا ہوگا جو اس خلافِ عقیدہ وہم کو دفع کرتا ہو، لہٰذا سیاق وسباق دیکھ کر اس لفظ یا تعبیر یا مجموعی مفہوم کا پتہ چلایا جائے، تاکہ عبارت اور عقیدہ میں مطابقت پیدا ہو جائے۔ لیکن جہاں عقیدہ بھی وہی ہو جو موہم عبارت کا متبادر ہے تو وہاں سیاق وسباق اور توجیہ وتاویل کا عمل لغو اور بے معنی ہوگا، اور صاحبِ عبارت کے عقیدے وزندگی کی تکذیب کا مرادف ہوگا، بنا بریں اس موقع پر یہ سوال یا مطالبہ پیدا نہیں ہوتا کہ پھر آپ نے مولانا مودودی کے ساتھ اس طرزِ مخالفت کو کیوں روا کر رکھا ہے جو فلاں کے ساتھ روا نہیں رکھا؟ کہا جائے گا کہ اس لئے کہ ان کی عبارتوں سے جو متبادر معنی مفہوم ہوتے ہیں انہیں ان کے عقائد واصول کی تائید حاصل ہے، اور عقیدہ وعمل دونوں میں مطابقت ہے، اس لئے یہاں سیاق وسباق سے تاویلی معنی نکالنے کی ضرورت نہیں، اور نکالے جائیں گے تو صاحبِ عبارت کا عقیدہ واصول اسے رَد کر دے گا۔

ہاں یہ معنی نکالنے یا واضح کرنے کی بات صرف ان میں چلے گی جہاں اصول وعقائد تو ہوں تعظیم وانقیاد کے اور ان کی کسی عبارت سے تعظیم کی بجائے توہین کا ایہام ہونے لگے، تو بلاشبہ سیاق وسباق دیکھ کر اور ان کی اعتقادی وعملی زندگی کو سامنے رکھ کر عبارت کے مرادی معنی واضح کر دیئے جائیں گے، تاکہ کلام متکلم کی زندگی سے ہم آہنگ ہو جائے۔ چنانچہ یہ ضرورت اگر پیش آتی ہے تو حضرت نانوتوی قدس اللہ سرہ' کی اس عبارت کے بارے میں پیش آتی ہے جس پر تکفیری فتویٰ کا شاخسانہ کھڑا کر کے اسے بطور عملی ثبوت کے مہیا کیا گیا ہے، کیونکہ عبارت کا یہ تکفیری مفہوم انکے اس عقیدہ کے سرتاسر خلاف ہے کہ انبیاءِ مقدسین کی طرف کسی معصیت کا ایہام کسی حال میں جائز نہیں اور کوئی لمحہ بھی ان پر ایسا نہیں گذر سکتا کہ ان سے خداوندی حفاظت اٹھالی جائے اور وہ عیاذاً باللہ کسی سوء اور برائی کے مرتکب ہوں، وہ تو صحابہ اور انکے بعد راسخین فی العلم کی بھی بلا چون وچرا اطاعت ضروری سمجھتے ہیں، چنانچہ ایسا نہ سمجھنے والوں ہی کے مقابلہ میں انہوں نے "**تصفیة العقائد**" تحریر فرمائی ہے۔

حضرت نانوتویؒ کی تحریر میں کتر بیونت کر کے انتہائی بددیانتی اور مسلکی تعصب کا ثبوت دیا گیا

ظاہر ہے کہ تصفیۃ العقائد کی جو عبارت پیش کی گئی ہے اس کا متبادر مفہوم اس عقیدہ کے خلاف ہے جو ابھی عرض کیا گیا، اس لئے ضرورت داعی ہوئی کہ ان کی عبارت کے سیاق وسباق کو دیکھا جائے اور عبارت نقل کرنے والے کے انداز اور مقصد کا جائزہ لیا جائے، سو یہ عبارتیں حضرتِ والا کے جس مضمون سے لی گئی ہیں وہ تصفیۃ العقائد کے تین صفحات اور ساٹھ سطروں میں پھیلا ہوا ہے، جس کا یہ ایک ایک جملہ دوسرے جملہ سے مربوط اور متعلق ہے، اس میں کذب کی حقیقت پر بحث کرتے ہوئے، نیز اس کی نوعیت اور اقسامِ ممنوعہ ومباحہ دکھلاتے ہوئے تنزیہہ ابراہیمی کا فرض ادا کیا گیا ہے، گویا ابراہیم علیہ السلام اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہر برائی اور معصیت سے پاک ثابت کرنے کیلئے یہ مضمون سپردِ قلم کیا گیا ہے، جس سے لوگوں نے توہینِ ابراہیمی نکال کر تکفیر کے لئے راستہ ہموار کرنا چاہا ہے، عبارت نقل کرنے والے نے صاحبِ عبارت کے مقصد کے تو خلاف کیا ہی تھا مگر خود عبارت کے بارے میں کیا کچھ کیا ہے، سو اولاً بقول آپ کے:

> ”عبارت نقل کرنے والے نے حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کا نام نہیں لیا، بلکہ اس انداز میں اس کو نقل کیا ہے گویا یہ بھی جماعتِ اسلامی والوں کی عبارت ہے، اس لئے کفر کا فتویٰ لگا کر خدمتِ اسلام کا فریضہ اختیار کیا گیا ہے۔“

عبارت نقل کرنے والے کا یہ اندازِ نقل آیا اس کی واقعی نوعیت یہی ہے کہ ”گویا یہ بھی جماعتِ اسلامی والوں کی عبارت ہے“ اور ”گویا“ کا لفظ محض احتیاط یا اندازِ معصومیت پیدا کرنے کے لئے رکھا گیا ہے جو اس اندازِ نقل کی پردہ پوشی کرتا رہے۔

یہ مسئلہ شاید اس سے حل ہو جائے کہ اول تو اس عبارت کی نقل کے اندازِ خاص کے تمام فوئد وبرکات جن کے لئے یہ انداز اختیار کیا گیا صرف جماعت اسلامی والوں کو پہنچیں، چنانچہ جن ”معروضات“ کے لئے ”عملی ثبوت“ درکار تھا وہ سب جماعت اسلامی والوں ہی کے ”معروضات“

ہیں، پھر یہ ''عملی ثبوت'' جماعت اسلامی والوں ہی کے لئے کار آمد تھا، نہ کہ دیوبند والوں کے لئے۔ پھر رازِ سربستہ (یعنی فتویٰ) کا اخفاء اور افشاء دونوں اپنے اپنے وقت میں جماعتِ اسلامی والوں کے لئے نفع بخش ثابت ہوئے، اخفاءِ راز کا اعلان کرکے تو جماعتِ اسلامی والوں کے لئے اہل دیوبند کے حق میں اِدّعاءِ ہمدردی آسان ہوگیا، اور افشاءِ راز سے دیوبند والوں کے لئے گویا ہوا خیزی کا سامان پیدا کرلیا گیا، اور یہ دونوں فائدے جماعت اسلامی کے تھے۔

غرض اخفاءِ راز، افشاءِ راز، غرض وغایتِ راز، عملی ثبوت اور معروضات کی تائید وتقویت جیسے منافع وفوائد سب کے سب جماعتِ اسلامی والوں ہی کے لئے ہوئے، تو کون کہہ سکتا ہے کہ عبارتوں میں نقل کا یہ اندازِ خاص جس سے یہ سربستہ راز، اور اس کا اخفاء وافشاء وغیرہ سب متعلق تھے، جماعتِ اسلامی والوں کا نہ ہوئے۔ نقل کے انداز کو چھوڑ کر ناقل کا انداز اور ان کی پر اسرار شخصیت کو دیکھا جائے تو نتیجہ قیاس کے بجائے نص ہوجاتا ہے، کیونکہ ''دعوت'' اخبار کے مقالہ سے تو معلوم ہوتا ہے کہ مستفتی اور مقالہ نگار الگ الگ دو شخصیتیں ہیں، چنانچہ مقالہ نگار لکھتے ہیں کہ:

''اس راز (فتویٰ تکفیر) کو افشاء تو نہ کرتا، مگر عبرت آموزی اور اپنی معروضات کے متعلق عملی ثبوت پیش کرنے کے لئے عرض کرتا ہوں......الخ۔''

آگے مستفتی کے بارے میں لکھتے ہیں:

''ایک مستفتی نے حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ کی مذکورہ عبارت (جو استفتاء میں نقل کی گئی ہے) کسی دوسرے دارالافتاء کو نہیں بلکہ دیوبند کے دارالافتاء کو بھیج دی۔''

دوسری جگہ لکھتے ہیں:

''عبارت نقل کرنے والے نے حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ کا نام نہیں لیا، بلکہ اس انداز میں اس کو نقل کیا ہے گویا یہ بھی جماعتِ اسلامی والوں کی عبارت ہے، اسی لئے کفر کا فتویٰ لگا کر خدمتِ اسلام کا فریضہ ادا کیا گیا ہے۔''

اس سے واضح ہے کہ مستفتی کوئی اور صاحب ہیں اور فتویٰ کے امین وراز دار ہمارے مقالہ نگار صاحب ہیں، جس سے ہم نے یہ سمجھ لیا تھا کہ مستفتی اور راز داروں میں پہلے سے کوئی سمجھوتہ ہوگیا ہو، تاکہ جوں ہی دیوبند سے فتویٰ پہنچے، اسے بصیغۂ راز چپکے سے مقالہ نگار صاحب کے پاس بھیج دیا جائے،

تا کہ وہ مناسب وقت آنے پر اس راز کو افشاء کر دیں اور ''معروضات'' کیلئے ''عملی ثبوت'' بہم پہنچ جائے۔

لیکن دارالعلوم کے دارالافتاء میں جو استفتاء پہنچا، جس میں یہ عبارتِ مذکورہ اس انداز میں نقل کی گئی ہے کہ ''گویا یہ بھی جماعتِ اسلامی والوں کی عبارت ہے'' تو اس میں مستفتی کا نام غلام نبی جالندھری لکھا ہوا ہے، اس سے کھلا کہ مستفتی اور مقالہ نگار صاحب ایک ہی ہیں جو بلاشبہ جماعتِ اسلامی کے ایک فرد بلکہ جہاں تک مسموعات کا تعلق ہے جماعت کے کوئی مؤقر عہدیدار بھی ہیں، اور مقالہ میں یہ دوئی محض غیر جانب داری باور کرانے کے لئے ظاہر کی گئی ہے، گو اس میں یہ اشکال پھر بھی باقی رہتا ہے کہ استفتاء اور مقالہ دونوں کے لکھنے والے تو ایک ہی صاحب ثابت ہو گئے، مگر مقالہ کی عبارت تو فصیح اردو کے ساتھ منشیانہ ہے، اور استفتاء کی عبارت نہایت بھدی اور بے تکی ہے، شاید اس سے کوئی اور تعمیہ اور اندھیرے میں رکھنا مقصود ہو، جو بھی صورت ہو، استفتاء اور مقالہ کے ذمہ دار ایک ہی صاحب ہیں اور وہ جماعتِ اسلامی کے فرد مقالہ نگار صاحب ہیں، اس اس سے ہم اس نتیجہ پر پہنچے کہ یہ استفتاء و استفسار اور نقلِ عبارت کا یہ اندازِ خاص جو کہ تکفیر کے فتویٰ کے لئے زمین ہموار کرنے کے لئے اختیار کیا گیا سب کچھ جماعت اسلامی والوں ہی کا کام تھا جس کا مقصد کسی نہ کسی طرح ایک ایسا فتویٰ حاصل کر لینا تھا جس سے وہ کام لیا جا سکے جو ''دعوت'' اخبار کے اس مقالہ سے لیا جا رہا ہے، اور ظاہر ہے کہ یہ مقصد بغیر اس ہیر پھیر کے حاصل ہونا مشکل تھا۔

پس عمل بھی جماعتِ اسلامی والوں ہی کا ہوا، اور اس کے فوائد و برکات بھی انہیں کے ہوئے، اور عامل کی شخصیت بھی انہیں کی ہوئی، اس لئے اگر ہم نے یہ رائے قائم کر لی کہ عبارت نقل کرنے والے نے اس انداز میں اس کو نقل کیا ہے کہ بلا لفظ ''گویا'' کے ''یہ بھی جماعت اسلامی والوں کی عبارت ہے'' تو کیا بیجا کہا، اور اگر جماعتِ اسلامی والوں نے یہ ''صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں'' والی پالیسی اختیار کی تو کیا بجا کیا؟ بلکہ اس طرزِ عمل کو آپ ہی کے الفاظ میں ہم یوں ادا کریں کہ:

''اس طرزِ عمل کو تو ضرور ہی ترک کر دینا چاہیئے تھا جو غلط ہونے کے ساتھ ساتھ بھونڈا بھی ہے۔''

غالباً ہم اس میں قصوروار نہ ٹھہرائے جائیں گے، اس خاص کارروائی کے ساتھ نقلِ عبارت

کے اندازِ خاص کی تفصیل یہ ہے کہ ایک طرف تو بقول آپ ہی کے ناقل نے حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کا نام ذکر نہیں کیا، صرف ایک گمنام عبارت لکھ کر بھیج دی، تاکہ مفتی واقعی صورتِ حال سے اندھیرے میں رہے۔ پھر کتاب کا حوالہ بھی نہیں دیا کہ مفتی کو کہیں اصل کتاب کی طرف مراجعت کر کے عبارت کا اصل موضوع اور فتویٰ سمجھنے کی نوبت نہ آجائے، کہ عبارت کا سیاق وسباق دیکھ کر کہیں مصنف کی اصل زندگی کی طرف مفتی کا رخ نہ پھر جائے کہ وہ عبارت کا صحیح محمل متعین کر دے۔

پھر اسے اور پیــــچ دار بناتے ہوئے کتاب میں جو مسئلہ ساٹھ سطروں میں بالتفصیل لکھ کر آخر میں نتیجہ نکالا گیا تھا ان میں سے صرف پانچ چار سطروں کا انتخاب کیا جس میں سے دو سطریں تو تصفیۃ العقائد (مجتبائی ص ۲۵ سطر ۱۵-۱۶) سے لیں، اور تین سطریں (ص ۲۸ سطر ۲، ۳، ۴) سے لیں اور ان کا اول و آخر سب چھوڑ دیا جن پر ان منقولہ سطروں کی مدعاء کا مفہوم موقوف تھا، پھر ان دونوں عبارتوں کو جو ص ۲۵ و ص ۲۸ کی الگ الگ تھیں اس طرح یکجائی طور پر نقل کیا جس سے یہ دونوں عبارتیں مل کر ایک مسلسل عبارت نظر آئے اور مطلوبہ نتیجہ (تکفیر) بآسانی برآمد کر لیا جائے، کیونکہ اس کے بغیر ''عملی ثبوت'' فراہم ہونے کی کوئی صورت نہ تھی۔

یعنی اندازِ نقل ایسا رہا کہ ''گویا یہ بھی جماعتِ اسلامی والوں کی عبارت ہے'' ان دونوں عبارتوں کے درمیان میں ۴۸ سطریں چھوڑ دی گئیں جو ان دونوں عبارتوں کے مدعاء کو دوسرے سے ملا کر نتیجہ پیدا کرتی تھیں، ادھر پہلی عبارت کے شروع کی ۶ سطریں چھوڑ دی گئیں اور دوسری عبارت کی آخر کی کئی سطریں چھوڑ دی گئیں جن میں اس مسئلہ کا وہ نتیجہ مذکور تھا جس سے انبیاء علیہم السلام کی تنزیہہ اور تقدیس ہوتی تھی، اس لئے کہ یہ سطریں دافع تکفیر تھیں۔

بہر حال یہ تصرفات تو مجموعی مسئلہ کی لمبی چوڑی ۶۰ سطری عبارت میں کئے گئے ادھر نقل کردہ عبارتوں میں بھی خاص دیانتداری سے کام لیا گیا کہ پہلی عبارت کے شروع میں سے جو صفحہ ۲۵ سے لی گئی ہے، لفظ ''پھر'' حذف کر دیا گیا جس سے سابقہ کلام پر ترقی واضح ہوتی تھی، جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اصل جواب تو آچکا ہے ترقی کر کے ایک بات یہ بھی کہی جا سکتی ہے، ناقل نے ''پھر'' کا کلمہ اڑا کر ترقی ہی کو اصل مدعا دکھلانے کی کوشش کی ہے۔ پھر اس عبارت سے لفظ ''اور'' بھی حذف کر دیا

ہے جس سے یہ واضح ہوتا کہ یہ ایک کبریٰ اور کلیہ ہے جو مسلمہ کل ہے، لیکن لفظ ''اور'' کے حذف ہو جانے کے بعد وہ صاحبِ عبارت ہی کا جزوی مدعا بن کر رہ گیا ہے۔

بہرحال دو الگ الگ عبارتوں کو ملا کر ایک دکھلانا، ان کے اول و آخر کو حذف کر جانا، درمیان کی کتنی ہی متعلقہ سطریں اڑا جانا، پھر نقل کردہ عبارتوں میں سے ادواۃِ ربط کو حذف کر کے عبارت نقل کرنا ناقل کی دیانت داری کا کافی ثبوت ہے، جو ظاہر ہے کہ کسی اہم رازِ سربستہ ہی کے لئے ہوسکتا ہے، اور راز دارانہ انداز ہی سے ہوسکتا تھا۔ لیکن اگر حضرتِ والا کی تمام عبارتوں اور ان کے سیاق وسباق کو ملا کر پڑھا جائے تو حضرت کا مفہوم تو ضرور واضح ہو جاتا مگر ناقل محترم کا تکفیری منصوبہ پورا نہ ہوسکتا اور ان کی تلبیسات کھل جاتیں جس سے ''عملی ثبوت'' میں رخنہ پڑ جاتا۔

صاحبِ تحریر کی اعتقادی اور عملی زندگی کے تناظر میں اس کے کلام کا محمل متعین کیا جائے گا

اس تفصیل سے میری غرض صرف ناقل و مستفتی کی کارروائی پر روشنی ڈالنا تھی، نہ یہ کہ آپ حضرت نانوتویؒ کی عبارت کے سیاق وسباق ملانے کی زحمت میں مبتلا ہوں اور پھر جھٹ کہہ دیں کہ اسی طرح مولانا مودودی کی عبارات کا سیاق وسباق بھی ملا لیا کرو۔ میں جس موضع پر متوجہ کرنے کی جرأت کر رہا ہوں وہ صرف یہ ہے کہ آپ عبارت کے سیاق وسباق سے زیادہ عبارت والے کی اعتقادی و عملی زندگی کو سامنے رکھ کر اس کی عبارت کا محمل اور مقصد متعین کریں۔ ناقلِ عبارات نے عبارتوں کو کتر بیونت کرنے کی بجائے اگر صاحبِ عبارات کے معتقدات واخلاق اور صفات کی زندگی کو دیکھ لیا ہوتا، یا استفتاء میں مفتی کو متنبہ کر دیا ہوتا تو ان کی عبارت کا مطلب خود بخود سامنے آ جاتا اور اس صورت میں بھی سامنے آ جاتا کہ عبارت اس کی ادائیگی سے قاصر بھی ہوتی، پھر بھی نہ بنتا تو اس کی زندگی کو سامنے رکھ کر اس کی تاویل کر لی جاتی۔ پس ہم اگر حضرت کی عبارت میں تاویل وتوجیہ سے کام لیں گے تو اس وقت کہ ان کی عبارت کا کوئی مفہوم ان کی اعتقادی زندگی کے خلاف مترشح ہوتا ہو، ورنہ نہیں۔

مثلاً اگر حضرتِ والا کے عقیدہ میں تنقیدِ عام کا کوئی ایسا اُصول ہوتا، جس کی رو سے سلف اور خلف پر بوچھار کرنا ان کی زندگی بن گئی ہوتی، اور وہ جوشِ تنقید میں انبیاء علیہم السلام تک کے بارے میں گہہ و بے گہہ حفاظتِ خداوندی اٹھ جانے کے قائل ہوتے جس سے انبیاء کی طرف ایہامِ کذب ہی نہیں عینِ کذب بمعنی معصیت کی نسبت بھی کوئی مستبعد نسبت نہ ہوتی، تو پھر سیاق وسباق ملا کر ان کی عبارت سے صحیح مطلب نکالنے کی کوئی ضرورت نہ ہوتی اور نکالا بھی جاتا تو ان کی زندگی اور ان کا عقیدہ اسے رَد کر دیتا، لیکن بحمداللہ وہ اس قسم کے اصول وعقائد سے بری ہیں تو ناقلِ عبارت کی تلبیسات اور ان سے پیدا شدہ تکفیری نتیجہ سے بھی بری ہیں، اور ہم توجیہِ حسن پر مجبور۔

عبارت سازی یا غلط واقعہ نگاری کے ذریعہ فتویٰ لینے کا وبال مستفتی پر

مسئلہ زیرِ بحث میں مستفتی نے مفتی کے سامنے جس انداز سے ایک گمنام عبارت پیش کر کے صورتِ سوال پیش کی، اس نے اس کو سامنے رکھ کر فتویٰ صادر کر دیا۔ اب اگر اس فتویٰ کی رو سے حکم عائد ہوا تو اس عبارت والے پر عائد ہوا جس نے حضرتِ والا کی اصلی عبارت کے بجائے خود اپنی تصرف کردہ عبارت بنام حضرتِ والا پیش کی، نہ کہ حضرتِ والا پر، کیونکہ یہ تصرف کردہ عبارت ان کی عبارت ہی نہ رہی، جیسا کہ حدیث میں ہے کہ لوگوں نے حضورِ اقدس علیہ السلام کو معاذ اللہ مـذمـم کہہ کر برا کہنا شروع کیا تو آپؐ نے فرمایا کہ یہ لوگ مذمم کو برا کہہ رہے اور میں محمد ہوں، جس سے واضح ہے کہ تعبیر بدل دینے کے بعد وہ تعبیر اس بدلنے والے ہی کی ہو جاتی ہے اور بدلی ہوئی تعبیر کے نتائج اسی کی طرف لوٹتے ہیں۔

اس لئے یہ فتویٰ اس کے لئے ہے جس نے یہ عبارت باندازِ مذکور بنائی، دارالعلوم دیوبند میں ہزار ہا استفتے موصول ہوتے ہیں، بیس بائیس ہزار فتاویٰ کا سالانہ اوسط ہے، استفتوں میں زید، عمر کی سینکڑوں باتیں اور عبارتیں، محاکموں اور فتوؤں کے لئے آتی ہیں، مفتی کو فرصت کب ہے اور اسکے

ذمہ کب ہے کہ وہ موصولہ عبارتوں کے ماخذ تلاش کرے، یا سائل سے بار بار مراجعت کر کے ان ماخذوں کے حوالے اور پتے معلوم کرے، یہ کام مستفتی کا ہے کہ کوئی عبارت حکم کے لئے بھیجے تو کتاب کا حوالہ دے تا کہ عبارت کے مالہٗ وماعلیہ کا اندازہ کر کے حکم لگایا جائے۔ نیز صاحبِ عبارت کا نام لکھے، کیوں کہ عبارت کا مقصد سمجھنے میں شخصیت کے انتساب کو بہت کچھ دخل ہے اس کے اوصاف وصفات اور مجموعی کیریکٹر ہی اس کی عبارت کے معنی سمجھاتا ہے نہ کہ محض کالے حروف اور سفید کاغذ۔ اس لئے مفتی اگر کسی گمنام عبارت کے سمجھنے میں غلطی کر جائے تو فی الحقیقت ذمہ داری مستفتی کی ہے نہ کہ مفتی کی۔ ہاں اگر عبارت کے ساتھ صاحبِ عبارت کا نام یا کتاب کا حوالہ مستفتی دے رہا ہے جو اُس کا فرض ہے پھر مفتی بلا مراجعتِ کتاب عبارت پر کوئی حکم لگادے، تو بلاشبہ اس کی بے احتیاطی سمجھی جائے گی لیکن استفتاءِ زیر بحث میں مستفتی نے تو وہ کچھ نہ کیا جو اس کا فرض تھا، تو مفتی نے اگر وہ کچھ نہ کیا جو اس کا فرض ہی نہیں تھا تو اس پر عند اللہ یا عند الناس کوئی ملامت نہیں ہوسکتی ہے، ورنہ مستفتی صاحب کے طرزِ عمل پر تو قرآن کی دو مختلف آیتیں جوڑ کر ایک شخصیت کیا سارے مسلمانوں کو کافر اور جہنمی ثابت کیا جاسکتا ہے:

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ: ایک جگہ سے لیا جائے اور اُولٰٓئِكَ اَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِیْهَا خَالِدُوْنَ: دوسری جگہ سے لیکر دونوں کو جوڑ دیا جائے تو سارے مسلمان بآسانی جہنمی ثابت ہوجائیں گے، گو یہ حرکت کوئی عالم مفتی نہیں کرسکتا کیونکہ قرآن کی آیتوں سے کم وبیش سب کو ہی مناسبت ہوتی ہے، حافظ ہو یا ناظرہ خواں، لیکن مفتی کے لئے دنیا بھر کی تمام کتابوں کا حافظ ہونا اور ان کی عبارتوں کا مستحضر رکھنا کہ عبارت سامنے آتے ہی وہ کتاب ومصنف سب کو ایک دم سمجھ جائے، نہ ضروری ہے نہ ممکن ہے، اور نہ دنیا کے کسی مفتی کا دستور ہی ہے۔ اس لئے اس استفتاء کے سلسلہ میں پیش کردہ عبارت کا حکم بتلا کر مفتی اپنے فرض سے سبکدوش ہوگیا، خیانت اس مستفتی پر عائد ہوتی ہے جس نے مفتی کو اندھیرے میں رکھ کر اس سے غلط حکم حاصل کرنے کی سعی کی، جو مستفتی کے لحاظ سے یقیناً غلط اور جعلی حکم تھا۔

مفتی کو انتہائی بصیرت اور تیقظ و بیداری کی ضرورت

بہر حال مستفتی نے مفتی کو مغالطہ میں ڈالنے کیلئے یہ طرزِ عمل اختیار کیا اور اس کی نقلِ عبارت میں کتر بیونت اور مغالطہ انگیزی کارگر ہوگئی، تاہم میں جرأت کر کے یہ ضرور عرض کروں گا کہ جس قدر عبارتیں مستفتی نے نقل کیں خواہ وہ کتر بیونت ہی کے ساتھ نقل کیں وہ بھی اس حکم کی مستحق نہ تھیں، جو حضرات مفتیانِ کرام نے ان پر صادر فرمایا۔ کیونکہ ایک مفتی نے تو اپنے فتوے میں انبیاء کے معاصی سے معصوم ہونے کا عقیدہ ظاہر کر کے (جو یقیناً حق ہے) حکم لگایا تو گویا یہ تسلیم کر لیا کہ استفتاء میں نقل شدہ عبارتوں سے یہ نکلتا ہے کہ انبیاء معاذ اللہ معاصی سے معصوم نہیں، اور دوسرے مفتی نے اس پر تکفیر کا حکم لگا کر یہ مان لیا کہ تصفیۃ العقائد کی عبارت میں کوئی منافیٔ اسلام بات ضرور موجود ہے، حالانکہ ان عبارتوں میں سے کسی ایک سے بھی یہ نہیں نکلتا کہ اس میں انبیاء علیہم السلام کو معاذ اللہ مرتکبِ گناہ یا ان کے حق میں ارتکابِ گناہ کا امکان تسلیم کیا گیا ہے۔ کیوں کہ پہلی عبارت کا حاصل تو یہ ہے کہ دروغ کئی قسم کا ہوتا ہے، ہر ایک کا حکم یکساں نہیں، نبی کا ہر قسم سے معصوم ہونا ضروری نہیں۔ دوسری کا حاصل یہ ہے کہ جب دروغ کی کئی قسمیں ہیں، کچھ جائز اور کچھ ناجائز، جن کی تفصیلات اسی کتاب کے درمیان متروکہ عبارتوں میں کر دی گئی ہیں) تو علی الاطلاق دروغ معصیت بھی نہ ہوا، اور اس لئے منافیٔ نبوت بھی نہ ہوا، تو ظاہر ہے کہ دروغ کی جو قسم شرعاً جائز ہوگی اور نبی سے اس کا ارتکاب مان لیا جائے تو وہ معصیت ہی کب ہوا جس کی طرف معصیت یا دروغ کی نسبت لازم آئے، کیونکہ معصیت کے معنی خلافِ شرع کرنے کے ہیں، وہ جائز قسم خلافِ شرع ہے کب کہ اس کا ارتکاب معصیت ہو، جب کہ وہ شرعاً جائز ہے، تو پھر اس عبارت سے یہ کب نکلا کہ نبی سے معصیت کے صدور کا امکان ہے، یا یہ عقیدۂ اہل سنت والجماعت کے خلاف ہے کہ صاحبِ عبارت پر اس کا الزام عائد کر کے انہیں مخالفِ اہل سنت والجماعت یا خارج از اسلام ہونے کا حکم لگایا جائے اور تجدیدِ ایمان اور تجدیدِ نکاح کا آرڈر دیا جائے۔

بہر حال اگر صرف وہی عبارتیں بھی سامنے رکھ لی جائیں جو مستفتی نے کتر بیونت کر کے نقل کی

ہیں تب بھی ان پر نہ کفر کا حکم لگ سکتا ہے نہ مخالفِ اہل سنت ہونے کا اتہام۔ اس لئے میرے خیال میں حضرات مفتیان کرام سے اس افتاء میں تسامح ہوا ہے اور انھوں نے عبارتوں کو سرسری دیکھ کر جن کا عنوان اپنے سیاق وسباق سے کٹ کر ذرا وحشت ناک سا تھا یہ حکم مذکورہ لگا دیا، گو میں ذوقاً یہ بھی سمجھتا ہوں کہ اس حکم کا منشاء عصمتِ نبوی اور عظمتِ نبوت کا مفتیوں کے قلوب پر بے پناہ استیلاء ہونا ہے، کہ اس میں محصور اور اس سے مغلوب ہو کر یہ غور نہ کر سکے کہ ان عباتوں کا ظاہر جیسا وحشت ناک نظر آرہا ہے، ان کے مدلول میں قطعاً وہ وحشت نہیں، مگر غلبۂ عظمتِ نبوی میں سرسری دیکھ کر یہ حکم لکھ دیا گیا، اس لئے منشاءِ حکم تو بلا شبہ قابل قدر ہے مگر خود حکم قابلِ ترمیم اور قابلِ رجوع ہے، اور مجھے امید ہے کہ حضرات مفتیانِ کرام اگر اس نقطہ پر پہنچ جائیں گے جو میں نے پیش کیا ہے، تو وہ اس فتوے سے رجوع ضرور شائع فرما دیں گے۔(۱)

خاتمۂ کلام

حاصل کلام یہ ہے کہ حضرت مولانا نانوتوی قدس سرہٗ کی ان زیر بحث عبارتوں کا سیاق وسباق ملا کر اور ان تمام درمیانی اور اگلی پچھلی عبارتوں کو جوڑ کر جن کو ناقل نے قطع وبرید کر کے مفتی کے سامنے ہی نہیں آنے دیا، یا اس سیاق وسباق کو چھوڑ کر صرف نقل شدہ عبارتوں ہی میں غور وفکر کر کے صحیح محمل سامنے لانے کی ضرورت محض اس لئے داعی ہوئی کہ ان کی اعتقادی اور عملی واخلاقی زندگی کے ساتھ وہ جعلی معنی نہیں بن سکتے تھے جو ناقلین نے اپنے مقاصدِ شئو مہ کی خاطر تصرفات سے بنانے چاہے، یا حضراتِ مفتیان کرام کی طائرانہ نظر اُنہیں نہ بھانپ سکی، اور تکفیر کا شاخسانہ کھڑا ہو گیا۔

لیکن مودودی صاحب کی عبارتوں میں جب کہ وہ اپنے متبادر معنی کے لحاظ سے سلف کے خلاف ہوں یا ان کی کسی تنقیص وتوہین پر مشتمل ہوں، تاویل کرنے یا سیاق وسباق ملا کر ایسی توجیہات کرنے کی کوئی ضرورت ہی نہیں، جن سے وہ سلف کے مسلک کے موافق یا ان کی شایانِ شان عظمت وعقیدت کا مظہر ہو جائیں کیونکہ ان کے یہاں بلحاظِ اصول وعقائد سلفِ صالحین اور ان کے طریقے کی

(۱) فتویٰ سے رجوع اس کتابچہ کے ختم پر چند صفحات آگے آرہا ہے۔ محمد عمران قاسمی بگیانوی

کوئی اہمیت ہی کب ہے کہ اس کی فکراُنہیں یا کسی کو دامن گیر ہو؟ وہ اصولاً ان کی غلطیاں پکڑنا، ان پر تنقید وگرفت کرنا اوران پر چھینٹے دینا، جائز خیال کرتے ہیں۔ اندریں صورت ان کی طرف سے ان کی ساری عبارتیں بھی اگر سلف کے طریقے کے خلاف ہو جائیں تو ہو جائیں، وہ ان کے طریقے اور ان کی ذہنی غلامی کی پرواہ کب کرتے ہیں؟ اس لئے ان کی عبارتوں سے تشبیہ دے کر کسی توجیہِ حسن کا مطالبہ کرنا ایک بے معنی مطالبہ اور خود اپنے اصول کی خلاف ورزی ہے، اس لئے مناسب ہے کہ ایک طرف تو ناقلِ عبارت و مستفتی صاحب قیامت کی جواب دہی کا منظر سامنے رکھ کر فرمائیں کہ انہوں نے عبارات میں خیانتوں کا طریقہ کیوں روا رکھا، اوراس خیانت کے ساتھ تکفیر کے لئے زمین کیوں ہموار کی؟ ادھر مقالہ نگار صاحب بھی قیامت کی جواب دہی کا منظر سامنے رکھ کر فرمائیں کہ انہوں نے حضرت نانوتویؒ اور مودودی صاحب کی شخصیتوں اور ان کے اصول وعقائد کے فرق کو جاننے کے باوجود (جبکہ وہ بہ اقرارِ خود دیو بند کے تعلیم یافتہ بھی ہیں) تاویل وتوجیہ کے اس فرق کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنے اساتذہ پر یہ الزام کیوں لگایا، کہ وہ مولانا مودودی کی کتابوں سے کچھ کچھ عبارتیں لے کر ان کی مخالفت کرتے رہنے ہی کو سب سے بڑا نصب العین سمجھ بیٹھے ہیں، یا چند مقررہ جزوی عبارتوں کے چند مفروضہ معانی کو بار بار دوہراتے رہنا اور خلاف ہوا دیتے رہنا ہی ان کا مشغلہ رہ گیا ہے، دراں حالیکہ ہم واضح کر چکے ہیں کہ ان کے سامنے مودودی صاحب کی یہ چند جزئیات ہی نہیں بلکہ ان کے اصول اور بنیادی عقائد ہیں جن کی بناء پر انہوں نے رائے قائم کی ہے اوروہ ان کی جزئیات اور جزئی عبارتوں میں توجیہ وتاویل کو غیر ضروری جانتے ہیں جبکہ ان کے اصول ان تاویلات کو برداشت نہیں کر سکتے۔

رہا یہ کہ موصوف کی جزوی عبارتوں یا جزوی دعاوی کے سمجھنے میں اگر کسی دیو بند والے سے اتفاقاً تسامح ہو گیا ہو یا بالفرض آپ کی کسی عبارت سے استنباطِ مسئلہ میں کسی نے پورے تیقظ سے کام نہ لیا ہو، تو اس کا حاصل زیادہ سے زیادہ یہ نکلتا ہے کہ مودودی صاحب فلاں جزئی میں غلط کار نہیں۔ مثلاً: انہوں نے فلاں صحابی کا تخطیہ نہیں کیا، یا فلاں کی توہین ہرگز نہیں کی، اور ایسا سمجھنا سمجھنے والے کی غلطی ہے، تو ممکن ہے کہ اس خاص جزئی واقعہ کی حد تک وہ حق بجانب ثابت ہو جائیں، لیکن یہ کہ

انہوں نے تخطیۂ صحابہ، تنقیدِ سلف کا اصول بھی ترک کر دیا ہے اس سے یہ ہرگز لازم نہیں آتا، اس لئے جو لوگ انہیں اصول کی وجہ سے غلط کار کہہ رہے ہیں وہ اس جزئی معاملہ میں ان کے حق بجانب ہو جانے پر بھی انہیں غلط کار ہی کہتے رہیں گے جبکہ غلط کاری کا اصول انہوں نے پلے باندھ رکھا ہے، اس لئے سطح پرست تو ممکن ہے یہی کہیں کہ جب فلاں بات کا جواب مودودی صاحب یا ان کے اتباع کی طرف سے دیا جا چکا ہے تو پھر ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ پھر بھی انہیں غلط رَوٹھیرا رہے ہیں، کیا قیامت کا منظر ان کے سامنے نہیں؟ لیکن حقیقت شناس حضرات کی نگاہ اس پر ہوگی کہ یہ جواب دہندے حضرات اصولِ مخالف کو باقی رکھ کر جو جزئیات کے جوابات میں مصروف ہیں اور غلطی کو بنا کر غلط رَوی کی اصولی راہ کو مضبوطی سے پکڑے ہوئے ہیں تو انہیں کیا ہو گیا ہے کہ یہ اب بھی ان علمائے حق کو غلط رَوٹھیرا رہے ہیں جن کی نگاہ ان غلط جزئیات سے زیادہ ان کے اندرونی غلط اصولوں پر ہے، جن کے ذریعہ سلف اور خلف سب ہی کی راہیں غلط ٹھہرتی جارہی ہیں، کیا قیامت کی جواب دہی کا منظر ان کے سامنے نہیں؟

بہرحال اختلاف رکھنے والوں کی نظر مثالوں پر زیادہ نہیں اصول وکلیات پر ہے، ان کی کوئی تبدیلی ابھی تک سامنے نہیں ہے اسلئے ان علماء کی رائے میں بھی کوئی تبدیلی نہیں ہے، محض جزئیات کے ردوبدل سے ان کی رائے پر کوئی اثر نہیں پڑسکتا، نیز اسی طرح جزوی عبارتوں کی توجیہ وتاویل بلاتبدیلیٔ اصول بیکار اور عبث بھی ہے، جس کا شکوہ کے ساتھ مطالبہ کیا گیا ہے اور **توجیه القول بما لا یرضی به القائل** کی مصداق بھی ہے، جس کی جرأت مقالہ نگار بھی نہیں کر رہے ہیں۔

یہی وہ طرزِ عمل ہے جس سے مسلمانوں میں تو انتشار پھیل رہا ہے کہ وہ عقیدہ وعمل کی زندگی سے دور ہو کر باہمی آویزشوں میں پھنس گئے ہیں اور غیروں میں جرأت بڑھ رہی ہے کہ وہ مسلمانوں کو اپنے میں منضم کرنے کی جرأت کر رہے ہیں، اگر یہ انشاء وادب کی قابلیتیں اپنا رخ اس طرف کئے ہوئے رہتیں کہ مسلمانوں کو تو سلف صالحین کے طریقہ پر جمایا جاتا، اور ان کے دلوں میں سلف کی عظمت، ان سے اسوہ شناسی اور ان معیاری زندگیوں سے عقیدت وعظمت کے ساتھ استفادہ کرنے کی امنگ بڑھائی جاتی، اور پھر ان سے مطمئن ہو کر اغیار کی راہنمائی اور انجذاب کی سعی کی جاتی تو کیا

اچھا ہوتا، اور یہ ہر وقت ممکن ہے، لیکن اگر یہ راہ اختیار نہیں کی جاتی تو میں آپ ہی کے الفاظ میں آپ کو خطاب کروں گا کہ:

''آپکا یہ طرزِ عمل بالکل غلط ہے، دین کی جڑوں میں کھرپا ہے، علماءِ کرام کے وقار کو گرانے کا موجب ہے، مسلمانوں میں انتشار وافتراق اور نفرت وحقارت کے جذبات مشتعل کرنے کا سبب ہے۔ آپ براہِ نوازش قیامت کی جواب دہی کا منظر سامنے رکھ کر فرمائیں، وہاں یہ مخالفتیں کسی طرح خدمتِ دین شمار نہ ہو سکیں گی، ان تخریبی سرگرمیوں کو ترک کر کے تعمیری امور کی طرف تمام قوتوں اور صلاحیتوں کا رخ پھیریئے۔''

آخر میں گزارش ہے کہ آپ بھی اسے جانتے ہیں اور ہم بھی **فیما بیننا و بین اللہ** سمجھے ہوئے ہیں کہ ہمیں آپ حضرات کی ذوات سے کوئی پرخاش نہیں، اتفاق واختلاف کا تعلق ذوات سے نہیں مسلک، طریقہ، اصول اور ذوق سے ہے، جس میں بنیادی بات ایک ہی ہے کہ ہم سلفِ صالحین، صحابۂ کرام، ائمہ مجتہدین اور متبعین کی عظمت واطاعت اور روایت ودرایت میں ان پر اطمینان اور ان کے آثار کی روشنی میں مقید ہو کر دین کو سمجھنا اور انہیں کے طریقِ عمل کو عملاً اختیار کرنا ضروری سمجھتے ہیں، اس کے خلاف نہ جانا چاہتے ہیں نہ کسی کو جاتا ہوا دیکھنا چاہتے ہیں، اس کے سوا ہمارا کوئی مقصد نہیں۔ ان اصول کے فرق سے ہم متفرق ہو جائیں گے اور انہیں کے جمع سے ہم جمع ہو جائیں گے اس لئے ہماری درخواست ہے کہ ادھر ہی دھیان دیا جائے اور اسی پر اپنی توجہات کو مرکوز کیا جائے۔

یہ تحریر چوں کہ جوابی ہے، اور بحث وجواب میں طبعاً قلم کہیں نہ کہیں لب ولہجہ والفاظ میں حدود سے متجاوز بھی ہو جاتا ہے، اس لئے بہ اُمیدِ معافی درخواست ہے کہ اس قسم کے تجاوز کو مقتضائے طبعیہ یا مقتضیاتِ اعتراض پر محمول کر کے نظر تسامح سے کام لیا جائے۔ **والحمد للہ اولاً و اٰخراً۔**

محمد طیب غفرلہ
مہتمم دارالعلوم دیوبند
۲۲ رجمادی الثانی ۱۳۷۵ھ

فتوے سے رجوع

ایک گمنام عبارت جس میں نہ کتاب کا حوالہ تھا نہ مصنف کا نام، مولوی غلام نبی صاحب جالندھری نے بصورتِ استفتاء مورخہ ۲۷/ربیع الاول ۱۳۷۵ھ کو دارالعلوم میں بھیج کر دارالافتاء سے فتویٰ (نمبر ۱۴۱/د) حاصل کیا، جس کی عبارت حسبِ ذیل تھی:

''انبیاء علیہم السلام معاصی سے معصوم ہیں ان کو مرتکبِ معاصی سمجھنا (عیاذاً باللہ) اہل سنت والجماعت کا عقیدہ نہیں'' اس کی یہ تحریر خطرناک بھی ہے اور عام مسلمانوں کو ایسی تحریرات کا پڑھنا جائز بھی نہیں۔ فقط واللہ اعلم سید احمد علی سعید

جواب صحیح ہے۔ ایسے عقیدے والا کافر ہے، جب تک وہ تجدیدِ ایمان وتجدیدِ نکاح نہ کرے اس سے تعلق قطع کر دیں۔

مسعود احمد عفا اللہ عنہ

نائب مفتی دارالعلوم دیوبند

لیکن ''دعوت'' اخبار مورخہ ۱۷/جنوری ۱۹۵۶ء کے ایک مضمون سے جو انہی مستفتی صاحب (غلام نبی) کے نام سے شائع ہوا ہے یہ عقیدہ کھلا کہ جو عبارت انہوں نے مستفتی بن کر بھیجی تھی، وہ ''تصفیۃ العقائد'' کی عبارت تھی جس کے مصنف بانیٔ دارالعلوم دیوبند حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس سرہٗ ہیں، اور اب وہ ہی مستفتی صاحب مودودی بن کر اس عبارت اور اس سے متعلقہ فتویٰ کو جماعتِ اسلامی کے اغراض کی تکمیل کے لئے ''دعوت'' اخبار میں شائع کر رہے ہیں۔ جس سے واضح ہوا کہ اس مغالطہ انگیز استفتاء سے ان کی غرض کسی مسئلہ کی تحقیق نہ تھی بلکہ اس حیلہ سے جماعتِ اسلامی کے مقاصد کے لئے کام نکالنا تھا جسے وہ اپنے مضمون میں عملی ثبوت کے عنوان سے تعبیر کر رہے ہیں۔ اس راز کے کھلنے پر تصفیۃ العقائد کی مراجعت کی گئی تو واضح ہوا کہ مستفتی صاحب نے یہ جعل سازی کی کہ مضمونِ متعلقہ میں سے دس سطور چھوڑ کر صفحہ ۲۵ سے عبارت کا ایک ٹکڑا لیا، اور پھر ۵۰ سطور چھوڑ کر صفحہ ۲۸ کی عبارت سے ۲۵ کی عبارت کو ملا دیا، نیز حروفِ عطف وترقی کو حذف کر کے ایک مسلسل عبارت کی صورت میں اسے پیش کیا اور ہمیں مغالطہ میں ڈالا، اور کچھ ہم بھی ان کے اس طرزِ عمل اور

اندازِ نقل سے غلطی میں مبتلاء ہوئے، جس کا نتیجہ مذکورہ فتویٰ وتصحیح کی صورت میں ظاہر ہوا۔

اب جب کہ ادھر تو یہ جعل سازی کی گئی اور اِدھر ہم فیما بیننا وبین اللّٰہ جانتے ہیں کہ صاحبِ عبارت حضرت نانوتویؒ بحمداللہ صحیح العقیدہ وکامل الایمان اہل سنت والجماعت حنفی تھے، بلکہ ان کی ایمانی روحانی تعلیمات وحکمت کی بدولت کروڑوں مسلمانوں کو صحیح العقیدہ اور اہل سنت والجماعت ہونے کا شرف نصیب ہوا، اس لئے ہم صاحبِ عبارت یا عبارت کے بارے میں دیئے گئے اس حکم سے رجوع کرتے ہیں، وہ حکم جو صاحبِ عبارت کے بارے میں دیا گیا غلط، غلط فہمی اور غلط اندازی کا نتیجہ تھا۔

جو لوگ اس فتوے سے کسی غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے ہوں وہ اس غلطی کو مستفتی کی غلط اندازی اور مغالطہ انگیزی پر محمول کر کے اپنے ذہنوں کو صاف کر لیں۔

سید احمد علی سعید
نائب مفتی دارالعلوم

مسعود احمد عفی عنہ
نائب مفتی دارالعلوم